اے حمید

ویران جزیرے

PDFBOOKSFREE.PK

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ویران جزیرے

اے حمید

2577839

مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ارے او شکاری !
چھاتیوں کے سوا میرے سارے جسم کا
گوشت لے کر مجھے چھوڑ دے۔
اتنا رحم کر،
میرا بچہ جو ابھی گھاس نہیں کھاتا، میری
راہ دیکھ رہا ہو گا۔

(ایک گمنام سنسکرت شاعر)

2006ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اہتمام
ملک مقبول احمد

مقبول اکیڈمی
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

قیمت = 150 روپے

خورشید مقبول پریس، لاہور

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج اس شہر کو میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔

کہاں جا رہا ہوں؟ یہ میں ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ میرا سامان یعنی چمڑے کا ایک تھیلا جس میں میری کتابیں بند ہیں میرے پاس بنچ پر رکھا ہے۔ میں بنچ پر بیٹھا، کسی دوسرے مسافر کے بہت بڑے صندوق پر پاؤں رکھے سگریٹ سلگائے کراچی جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔ میری جیب میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ میرے دل میں اُن دوستوں کے زخم ہیں جو مجھے چھوڑتے نہیں آئے۔ یہ لاہور اسٹیشن کا ایک پلیٹ فارم ہے۔ میرے قریب ہی ایک بزرگ تشریف فرما ہیں! انھوں نے کوئی کتاب کھول رکھی ہے اور بڑے انہماک سے اس کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ میں اس کتاب کے اوپر سے نظریں اٹھائے اس خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہا ہوں جو اپنے کنبے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ سامان کے ڈھیر کے پاس نقاب اٹھائے بیٹھی ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی اپنے اچکن پوش باپ کی نظر بچا کر میری طرف دیکھ کر تھوڑا بہت شرما لیتی ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں شرم ہماری عورتوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور بے شرم عورتیں تو موقع ملنے پر بہت ہی شرماتی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میں اس شہر کے گلی کوچوں سے اس دن رخصت ہوں گا جس دن موسلا دھار بارش ہو رہی ہو گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بارش نے دیر کر دی اور میری جدائی کی گھڑی آن پہنچی۔ ویسے یہ مارچ کے دن ہیں اور میں نے کل دیکھا تھا کہ مال روڈ پر سماوار ٹی ہاؤس کے باہر ایک آدمی سویٹ پیز اور گلاب کے رنگ برنگ خوشبو دار پھول بیچ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ باغوں میں پیڑوں پر پھول کھل رہے ہوں گے۔ کالے بھنورے بھی منڈلا رہے ہوں گے اور لاہور کی خوبصورت لڑکیاں بھی گشت لگا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی ہوں گی۔

لیکن مجھے اس سے کیا؟ میں تو آج یہاں سے جا رہا ہوں۔ پھر کبھی نہ آنے کے لیے۔ میں نے خود سے ہوتے ہوئے کسی سے ہاتھ نہیں ملایا۔ کسی نے مجھے سینے سے نہیں لگایا۔ کسی نے میرے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا کسی نے کانپتے ہونٹوں سے محبت کے دو بول نہیں کہے۔ چچی کے گھر سے میں روز کی طرح آوارہ گردی کرنے نکلا کے باہر نکلا اور سیدھا سیشن پہر آگیا۔ یہ شام کا وقت ہے۔ سماوار ٹی ہاؤس میں میرے سارے دوست جمع ہوں گے۔ چائے کی گرما گرم محفل جمی ہوگی۔ خوشبو دار چائے کے جوش میں بے معنی باتیں ہو رہی ہوں گی۔ جو وہاں نہیں ہوگا اس کی مخالفت ہو رہی ہوگی۔ جو بیٹھے ہوں گے وہ ایک دوسرے کی خوشامد کر رہے ہوں گے۔ تعریفوں کے پل باندھ رہے ہوں گے۔

"بس شعر تو تم پر ختم ہے۔"

"تنقید میں تمہارا کہا حرفِ آخر ہے۔"

"تم اس دور میں افسانے کے پیش امام ہو۔"

"تمہاری پینٹنگ دیکھ کر تو مجھے گوگین سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"اور تمہارے ویکلی کا تازہ اداریہ پڑھ کر تو میں پاگل ہو گیا ہوں۔ کیا دور کی کوڑی لائے ہو۔"

"میں اس پر ضرور ایک نظم لکھوں گا۔"

"پرسوں ہمارے کالج کی لڑکیاں بار بار مجھ سے تمہارے ناولوں کے فن پر روشنی ڈالنے کو کہہ رہی تھیں۔ یار تم لڑکیوں میں بڑے پاپولر ہو۔"

کوئی دوسرے کی تعریف کرتے ہوئے اس میں سے اپنی برتری اور ستائش کا پہلو نکال رہا ہوگا۔ کوئی دوسرے کی مذاح کرتے ہوئے تیسرے کی غیبت کر رہا ہوگا۔ کوئی ان لڑکیوں کے ساتھ اپنے معاشقوں کی داستانیں بیان کر رہا ہوگا جو اسے کبھی نہیں ملی ہوں گی۔ کوئی ان اچھی بری باتوں میں شریک ہو کر اپنے آپ کو [illegible] ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ میرے چائے کی پیالے اٹھائے ادھر سے ادھر گردش کر رہے ہوں گے میں ان لوگوں کو روز ملتا تھا لیکن ان میں سے کسی کو بھی میرا انتظار نہ ہوگا۔ اس کا مجھے افسوس بھی نہیں کیونکہ میں نے بھی ان میں سے کسی کا کبھی انتظار نہیں کیا۔ میں بھی انھیں ——— ان ہی کی سکھلائی ہوئی خود پرستی اور ظاہر داری سے ملتا رہا ہوں ہم

ہمیشہ ایک دوسرے سے اس طرح ملتے رہے ہیں جیسے ہم نے ایک دوسرے کے بغیر قیامت کی رات بسر کی ہو۔ مگر جدا ہو کر اس طرح بھول جاتے رہے ہیں گویا زندگی میں ایک دوسرے سے ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔

سماوار ٹی ہاؤس ——— شہر کی مشہور سڑک مال روڈ پر ایک چائے خانہ ہے بلکہ اسے ایک ادبی تفریح خانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں بیٹھنے والے ادبی طائفوں پر ان ڈاکوؤں کا گمان ہوتا ہے جو لوٹا ہوا مال چھپا کر وہاں بیٹھے ہوئے بنیے ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہوں۔ میں اب اس ٹی ہاؤس کو صرف سماوار ہی کہوں گا۔ یہ نام کسی بڑے ہی ستم ظریف نے رکھا ہے کیونکہ یہاں لوگوں پر جما ٹھیک بیٹھا ہے۔ سماوار کی طرح یہ لوگ بھی اندر ہی اندر ایک دوسرے کے خلاف کھولتے رہتے ہیں پکتے رہتے ہیں، منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں مگر کیا مجال جو باہر سے چھینٹا بھی پڑ جائے۔ یوں تیلیسی کھول کر رہ گئے کہ طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔

میرا اپنا بھی طرزِ عمل یہی رہا ہے اور اب تو اسی کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ میں نے جس لڑکی سے محبت کی ہے اس پلیٹ فارم پر بیٹھا کسی وقت اس کے خلاف بھی دل ہی دل میں باتیں بنانے لگ جاتا ہوں۔ یہ چلبازی اور ریاکاری یا تو ہم لوگوں نے سماوار سے لی ہے اور یا اس ہوٹل کو ہم نے عطا کی ہے۔ اس کے جراثیم یہاں سے نکل نکل کر مال روڈ پر پھیلتے رہتے ہیں۔ میں نے اکثر اس سڑک پر اس مرض کے بیمار دیکھے ہیں۔

میرے دوستوں اور لاہور شہر میں گذرے ہوئے دنوں کے احوال تو آپ آگے چل کر پڑھ ہی لیں گے۔ پہلے میں اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دوں۔ میرے ماں باپ نے میرا نام علم دین رکھا تھا۔ جوان ہو کر مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاس نہ تو علم ہے اور نہ دین۔ چنانچہ میں نے اپنا نام بدل کر چنار رکھ لیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ درخت پہاڑیوں کی بلندیوں پر اگتا ہے۔ اور میں تاریک گھاٹیوں کا معمولی پتھر ہونے کی وجہ سے پہاڑ کی چوٹیوں سے پیار کرتا ہوں۔ دوسرے درخت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یہ ہندو کے گھر میں آگے چاہے مسلمان کے گھر میں آگے یہ درخت ہی رہے گا۔ کالی داس یا کریم بخش نہیں بنے گا۔ انسان تاریخ کو ہمیشہ دھوکا دیتا آیا ہے۔ کبھی بندر بن کر کبھی بن مانس بن کر اور کبھی انسان بن کر۔ اور ابھی کیا کیا بن کر یہ دھوکے دے گا اور دیتا ہی چلا جائے گا۔ لیکن درخت ہمیشہ درخت رہا ہے۔ اور درخت ہی رہے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری ماں میری پیدائش کے صدمے کی تاب نہ لا کر مجھے جنم دیتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ میرے
ذرا سخت جان قسم کا آدمی تھا وہ مجھے پڑھا لکھا کر، دنیا داری کے سارے کاروبار ی گر سکھا کر، یہ تو
کہ کہاں جھوٹ کو سچ کر دکھانا ہے کہاں سچ کو جھوٹ میں بدل دینا ہے میری والدہ سے جاملا۔ ہم لوگ گورداسپور
شہر میں رہا کرتے تھے۔ میرا باپ لاہور سے بوریوں میں کتابیں بھر کر لاتا اور بہت بڑے منافع پر دیہات
میں فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ مذہبی کتابیں ادھار پر بھی دے دیا کرتا۔ ایسی حالت میں منافع دوگنا کر دیا جاتا
تھا۔ اس شخص نے گورداسپور میں سات مکان بنوائے۔ ہر مکان کا کرایہ وصول کرنے وہ میلا سا کوٹ پہن کر خود
جایا کرتا اور کرایہ داروں سے بڑی سختی سے پیش آتا۔ میرا بڑا بھائی بڑا عیاش آدمی تھا۔ اس نے ایک شادی
ماں باپ کی مرضی سے کی۔ اور دوسری شادی اپنی مرضی سے۔ یہ دوسری عورت امرتسر کی ایک طوائف تھی پہلی
بیوی کوٹی بی ہو گئی۔ جیسا کہ ہمارے ہاں دوسری بیوی کے آجانے پر پہلی بیوی کو عام طور پر ہوجایا کرتی
ہے۔ وہ مر گئی بھائی صاحب نے ایک اور شادی کر لی۔ اب طوائف نے ہتھکنڈے دکھانا شروع کر
دیئے۔ اور ایک روز وہ ڈھیر سارا زیور لے کر فرار ہو گئی۔ بھائی صاحب نے ایک بار پھر شراب اور رنڈی
بازی شروع کر دی۔ باپ کی وفات کے بعد انھوں نے ایک ایک کر کے ساتوں مکان شراب
اور رنڈی بازی کی نذر کر دیئے اور جب بالکل قلاش ہو گئے تو ایک دن شراب کی پوری بوتل چڑھا
کر کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

کاروبار کا دیوالہ پٹ گیا۔ میں کالج میں پڑھ رہا تھا۔ مجبوراً پڑھائی کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور
اپنی خالہ کے ہاں اٹھ آیا۔ خالہ بڑی نیک عورت تھی۔ نماز روزے کی بے حد پابند۔ دالان کے عین
بیچ میں بیٹھ کر دھنو کیا کرتی اور نماز پڑھتے ہوئے برابر دیکھتی رہتی کہ گھر میں کون آرہا ہے، کون جا
رہا ہے۔ خالہ کی دو لڑکیاں تھیں ایک چھوٹی اور دوسری بڑی۔ بڑی لڑکی کا نام بلقیس تھا۔ ویسے تو
میں رشتہ داری کا حق رکھتے ہوئے دونوں لڑکیوں سے محبت کی پینگیں بڑھا سکتا تھا مگر میں نے بلقیس کو
منتخب کر کے اسی سے عشق شروع کر دیا۔ گھریلو عشق بڑے مزے کے ہوتے ہیں اور یہ ہم تساہل پسند
نوجوانوں کے لیے تو اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں نہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ بھی خوب نکھرتا ہے۔
بڑی سے عشق کرتا دیکھ کر چھوٹی جلنے لگی۔ اس نے ہمارے خلاف محاذ بنا لیا۔ میں بڑا گھبرایا کہ کہیں
بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ چھوٹی کو بھی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھلا کب میری باتوں میں آتی تھی۔

ایک روز میں اور بلقیس باتیں کر رہے تھے کہ چھوٹی لڑکی خالہ کو لے کر وہاں آن موجود ہوئی۔ خالہ نے دیں
ہم دونوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شام کو مجھے وہاں سے دیس نکالا مل گیا۔ میں اپنی چچی کے گھر چلا گیا۔ خدا کا
شکر ہوا کہ چچی کی کوئی لڑکی نہیں تھی۔ وگرنہ ایک دن اس گھر سے بھی ذلیل و خوار ہو کر نکلنا پڑتا۔ کیونکہ عشق
اس خاکسار کی گھٹی میں پڑا ہے۔

چچا ریلوے میں میرے لیے ملازمت کا بندوبست کر ہی رہے تھے کہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور ایک دن
ہم سب لوگوں کو وہاں سے کوچ کرنا پڑ گیا۔ بٹالے کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہو گیا چچی کو لوگ اٹھا کر لے گئے
چچا زخمی ہو گئے۔ راستے میں ان کی حالت خراب ہو گئی اور وہ لدھیانے پہنچ کر انتقال کر گئے۔ بڑے نیک
آدمی تھے۔ پاکستان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ ان کی آخری خواہش تھی کہ ان کا دم پاکستانی سرحد پر اپنی
نئی مملکت کا جھنڈا دیکھ کر نکلے۔ خدا نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی۔

میں لاہور آ گیا۔

لاہور شہر میرے لیے نیا نہیں تھا ہاں یہاں کے حالات ضرور نئے تھے۔ پہلے کچھ دن تو میں مہاجرین کیمپ
میں رہا۔ کیونکہ یہاں جو ہمارے دور کے رشتہ دار رہا کرتے تھے وہ فسادات کے ہنگاموں سے گھبرا کر اپنے
ایک اور دور کے رشتہ دار کے پاس ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ساری گرمیاں پہاڑ کے صحت افزا
مقام پر اور میں نے مہاجرین کیمپ کے غیر صحت مند ماحول میں گذار دیں۔ وہ لوگ جب واپس آئے تو ان کی
صحت پہلے سے بھی خراب تھی۔ کیونکہ انھیں چیڑھ کے ٹھنڈے سایوں والے جنگلوں اور ہمکیلی برف کی وادیوں
میں بھی اپنے کاروبار کی تباہی کا غم کھاتا رہا۔ میرا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا۔ ایک ایک کر کے سبھی
(سوائے جوان لڑکیوں کے ——— صد افسوس) بغلگیر ہوئے۔ ایک ایک کی خیریت دریافت کی۔ میں یونہی جھوٹ
موٹ بتاتا رہا کہ فلاں کو سکھ اپنے ساتھ لے گئے، فلاں نے میرے سامنے دم توڑا، فلاں کو جب میں نے آخری
بار قافلے میں دیکھا تو اس کا حال بڑا پتلا ہو رہا تھا۔ یہ سن کر ان لوگوں نے توبہ استغفار شروع کر دی اور دل میں
اپنی پرسکون اور سلامتی کی حالت پر خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ کنبہ شہر کے ایک پرانے مسلمانوں کے محلے میں آباد تھا۔ صاحب خانہ جن کا نام ڈاکٹر عبدالواحد تھا۔
ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر تھے اور دن بھر بوسیدہ چھت والی دکان میں بیٹھے مکھیاں مارا کرتے۔ بڑھاپا شروع
ہو چکا تھا لیکن بڑے شوقین مزاج تھے۔ جوانی میں دوستوں کے مال پر عیاشیاں کی تھیں اور اب دو بڑے لڑکوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے جیبوں پر اپنی جوانی کی روایت کو نباہ رہے تھے۔ اُن کی عیاشی اب صرف اپنے بڑے لڑکوں کے گھگھو
سوٹ پہننے اور مرغن پکوان پکوانے تک ہی محدود تھی۔ مرجھایا ہوا چہرہ صفاچٹ تھا۔ سر کے بال سفید تھے
جھکے ہوئے جسم کی ہڈیاں چلتے ہوئے کھڑکھڑاتی تھیں۔ ہزار بیماریاں انھیں خود لگی تھیں۔ دکان کی نصف درجن
وہ خود ہضم کر چکے تھے۔ ہر پانچ منٹ بعد پانی کے ساتھ کوئی پڑیا نگل جانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جوڑوں
میں ان کے درد رہتا۔ گرمی سے آن کے روگی تھے۔ آنکھوں سے ہر وقت پانی بہا کرتا۔ سر کے بال گھور بڑی
کے عین بیچ میں سے بالکل ہی اڑ گئے تھے۔ ویسے تو یہ صاحب بڑے بھولے بھالے بن کر بیٹھے رہتے اور بچوں
میں بچوں کی طرح معصوم بننے کی کوشش کیا کرتے۔ لیکن حقیقت میں یہ بڑے مکار، مطلب پرست اور
خطرناک تھے۔ اس جنگلی بلے کی طرح جو جنگل میں درخت پر بیٹھا رہتا ہے اور اچانک آپ کے سر پہ حملہ کر
دیتا ہے۔ روپیہ ان کا ایمان تھا اور اسے وہ ہر حالت میں حاصل کر لیتے۔ غیرت یا بے غیرتی کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا تھا۔ ایک لڑکی منٹگمری میں ایک زمیندار سے بیاہی ہوئی تھی۔ آپ مہینہ مہینہ بھر وہاں جا کر رہتے
خوب مرغ اڑاتے اور واپس آتے ہوئے لڑکی سے سو پچاس روپے بھی لے آتے۔

گھر میں وہ جس آرام کرسی پر آرام فرمایا کرتے۔ کوئی ملنے والا آتا تو اس کے ساتھ گھنٹوں مختلف امور پر
باتیں کرتے۔ ہر بات میں وہ یونان کے ایک پفناتوس نامی فلسفی کا حوالہ ضرور دیتے۔

"ابھی حال ہی میں میں نے پفناتوس کی ایک کتاب پڑھی ہے۔ یونان کا بڑا مشہور فلسفی تھا۔ سقراط اس
کا شاگرد تھا۔ اسی نے تو اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ چودھویں صدی میں ایٹم بم ضرور بنے گا۔"

"کیا نام تھا اس کا کارتوس؟"

"پفناتوس بابا ـــــ کمال کرتے ہو تم بھی۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے بدر چمہر کی شاہِ طلسمات پڑھی ہے؟
نہیں؟ ارے بھئی ایران کا بڑا نامی گرامی جادوگر تھا۔ پفناتوس کے بعد تو۔۔۔۔"

نماز انھوں نے کبھی نہیں پڑھی تھی اور محلے کی نماز کمیٹی کے صدر تھے روزہ بیماری کا بہانہ بنا کر گول
کر جاتے اور گھر میں ہر ایرے غیرے سے پوچھ لیتے کہ اس نے روزہ بھی کبھی رکھا ہے یا نہیں؟ انھیں ان کے
بے تکلف یار ڈاکٹر ہومیو کہا کرتے۔ ڈاکٹر ہومیو کو ہومیوپیتھی سے عشق تھا۔ رات رات گئے تک پرانی
رکم خوردہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہا کرتے۔ انگلی پر لب لگا کر بڑی احتیاط سے کتاب کا بوسیدہ ورق
الٹتے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر پڑھنے لگتے۔ بیچ بیچ میں کسی وقت سر کو جھٹک کر بول اٹھتے۔

"بات ہوئی ناں ـــــ یہ جرمنی کی قوم بھی کیا قوم ہے۔"

انگریزی انھیں بالکل نہ آتی تھی۔ وہ تو اکثر کہا کرتے تھے۔

"بھئی میں نے اردو میں ایم بی بی ایس کیا ہے۔"

ان کی بیگم بھاری بھرکم دھڑے کی عورت تھی۔ پکوان پکانے کا اسے بھی بہت شوق تھا۔ کھڑے کھڑے زردے
کی دیگ دم کر دیتی۔ ڈاکٹر ہومیو کو ہر بات پر جھاڑ کر رکھ دینا اس عورت کا محبوب مشغلہ تھا۔ دو بڑے لڑکے
ملازمتیں کرتے تھے۔ چھوٹی لڑکی نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی اور بڑی لڑکی سکول کی پڑھائی ختم کرنے کے
بعد کسی موزوں عاشق کی تلاش میں تھی۔ اس لڑکی کا نام زلفی تھا۔ اصل نام تو کچھ اور تھا۔ لیکن پیشانی پر
ایک کٹی ہوئی زلف سدا لٹکی رہا کرتی۔ اس رعایت سے بی بی نے اپنے آپ ہی زلفی نام رکھ لیا تھا۔
چھوٹی لڑکی کا نام اختر تھا۔ ان کے ساتھ اپنے معاشقے اور کارناموں کا ذکر تو آپ کو آگے چل کر ملے گا۔
پہلے میں آپ کو اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ ملوا لوں۔

اب میں صیغہ واحد متکلم میں بات کرنا بند کر رہا ہوں۔ اور اپنی اس شہر میں گذر رہی ہوئی زندگی
کے حالات اس کہانی کے لکھنے والے کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ سے میری بالمشافہ گفتگو ناول کے اختتام
پر ہو گی۔ جب آپ مجھے لاہور سے رخصت کرنے سٹیشن پر آئیں گے آپ اتنی دیر کے لیے میری زندگی
کا مطالعہ کریں اور میں پلیٹ فارم کے اس بنچ پر بیٹھا سامنے بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی کا مطالعہ کرتا ہوں
اگر یہ لڑکی بھی کراچی جا رہی ہے تو سفر خوب کٹے گا۔ ہاں بھولئے گا نہیں ـــــ میرا نام چنا رہے۔ مجھے
لاہور کی گہما گہمیوں، خود غرضیوں، دکھوں اور تو چ کھسوٹ سے بھری ہوئی ہماہمی میں پہچان لیجیے گا۔
میں کہانی بیان کرنے والے سے درخواست کروں گا کہ وہ میری لاہور والی زندگی کی داستان کا آغاز
شاہدرے والی پکنک پارٹی سے کرے ـــــ"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پکنک پارٹی والی وہ سہ پہر بہت ہی خوبصورت تھی۔

کچھ لڑکے اور لڑکیاں مقبرہ جہانگیر کے ایک عقبی پلاٹ میں درختوں کے درمیان گھاس پہ قالین کا ایک ٹکڑا بچھائے بیٹھے تھے۔ کوئی آئس کریم اڑا رہا تھا کوئی اورنج کی بوتل ہاتھ میں لیے کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی پھول جیسی پیاری بچی کو گھاس پہ انگلی تھامے چلنا سکھلا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ اگرچہ گرمیوں کا موسم تھا مگر فضا بڑی خوشگوار تھی۔ سورج کو بادلوں نے چھپا رکھا تھا۔ اور دریائے راوی کی طرف سے بڑی ٹھنڈی اور مرطوب ہوا کے جھونکے چلے آ رہے تھے جن میں دریائی سرکنڈوں اور ذخیرے والے درختوں کی گیلی گیلی مہک تھی۔

ایک کٹے ہوئے بالوں والی لڑکی باسکٹ میں سے تھرموس نکال کر پیالوں میں گرم چائے انڈیل رہی تھی۔ ایک لڑکا پاس ہی بیٹھا اس کے جھکے ہوئے خوبصورت جسم کو مسلسل تک رہا تھا۔ لڑکی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"روحی تمہیں شرم آنی چاہیئے۔"

"نسٹی آئی لو یو۔"

"شٹ اپ"

روحی قہقہہ لگا کر ہنستا ہے۔ یہ ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے کزن ہیں یعنی ایسے رشتے دار جو وقت پڑنے پہ کبھی بھی رشتہ استوار کر سکتے ہیں۔ ان میں کوئی روحی ہے تو کوئی نسٹی۔ کوئی ایمی ہے تو کوئی ٹمی۔ کوئی آنٹی ہے تو کوئی سسٹر۔ کسی نے امریکی کاؤ بوائے کا لباس پہن رکھا ہے۔ کوئی ٹی شرٹ پہنے ہوئے ہے اور کسی نے چست پتلون یعنی جینز زیب تن کر رکھی ہے۔ لڑکوں

کے جسم مضبوط ہیں۔ لڑکیوں کے لباس بھی چست ہیں۔ کمر، سینہ اور کولہوں پہ قمیضیں بری طرح پھنسی ہوئی ہیں۔ بال تقریباً سبھی لڑکیوں نے کٹوا رکھے ہیں۔ کسی کے بالوں کا فیشن فرانسیسی ایکٹرس برجیت باردو سے تو کسی کا حلیہ ایران سے ملتا ہے۔ انھوں نے بھنویں تیکھی بنوا رکھی ہیں۔ ہونٹوں پہ لپ سٹک کی گہری تہہ چڑھی ہے اور کپڑوں پہ عطر کی پوری کی پوری شیشی انڈیل رکھی ہے۔ یہ آپس میں بڑی بے باکی سے باتیں کرتے ہیں اور کسی بات پہ بھی شرماتے یا جھجکتے نہیں۔

روحی نے گراموفون پہ کسی انگریزی دھن کا ریکارڈ لگا دیا ہے۔ اب ایمی اور نسٹی ڈانس کرنے لگے ہیں۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے انھیں روک دیا ہے۔

"بے بی یہ شاہدرہ ہے۔ یہاں لوگ جمع ہو جائیں گے۔ پلیز بے بی۔"

بے بی منہ بنا کر ایمی سے الگ ہو گئی ہے۔ یہ سب لڑکے لڑکیاں انگریزی سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ یہ مسلمان گھروں میں پیدا ہوئے ہیں لیکن کسی طرف سے بھی مسلمان معلوم نہیں ہو رہے۔ یہ آنکھیں بند کر کے فراٹے انگریزی بولتے ہیں اور منہ کھول کر اردو بولنے والے کو تکتے رہ جاتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو لباس کو یہ مولویوں کا درخہ خیال کرتے ہیں۔ انھیں اگیتھا کرسٹی، پیٹر چینی اور گھٹیا قسم کے امریکی جنسی اور جاسوسی ناولوں کے ٹکڑے کے ٹکڑے ازبر ہیں۔ لیکن اقبال، غالب، کرشن چندر یا پریم چند کے نام سے بالکل ناآشنا ہیں۔

ابھی ابھی اس منڈلی میں ایک دبلا پتلا سا نوجوان آیا ہے جس کا ان لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے۔ اس نوجوان کا نام ویسے تو علم دین تھا۔ لیکن علم اور دین دونوں سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اس شخص نے نہایت ایمانداری سے اپنا نام چنار رکھ لیا ہے۔ چنار کو اس محفل کے لوگ مسٹر چیری کہا کرتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ہم بھی اب اس نوجوان کو چیری کے نام سے ہی یاد کریں گے۔ چیری کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہے۔ گہری سیاہ آنکھوں میں بڑی تیز چمک ہے۔ بال سیدھے ہیں اور کنپٹیوں پہ ذرا ذرا سفید ہو گئے ہیں۔ آواز بھاری، سنجیدہ اور چال میں تساہل اور خود اعتمادی کی لطیف امتزاج ہے۔ براؤن مکیش کے ساتھ اس نے ورسٹڈ کی گرے پتلون اور آسمانی رنگ کی نصف آستینوں والی قمیض پہن رکھی ہے۔ چہرے پہ چمک ہے اور کپڑوں سے فارول سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چیری ہم تمہیں مس کر رہے تھے۔ تم کہاں چلے گئے تھے۔؟"

"ہم نے سماوار میں رنگ بھی کیا تھا۔" نیلی آنکھوں والی نجمی نے بڑے دل ربا انداز میں آنکھیں جھپکا کر کہا۔ وہ چیری کے خوبصورت کپڑوں، دلکش گہری سیاہ آنکھوں کی چمک اور اس کے بدن سے اٹھنے والی مارول کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی خوشبو سے بہت متاثر تھی اور ان چیزوں کی وجہ سے چیری کو لائیک یعنی پسند کرنے لگی تھی۔ چیری بھی نجمی کو اس کی نیلی آنکھوں، بھرے بھرے کولہوں اور دلگداز بازوؤں کی وجہ سے بہت لائیک یعنی پسند کرتا تھا۔ وہ کئی بار ایک دوسرے سے اظہار محبت کر چکے تھے اور کئی بار ایک دوسرے کا منہ چوم چکے تھے۔ نجمی نے جب اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو چیری مسکرایا۔

"میں راوی میں بوٹنگ کر رہا تھا۔"

نجمی کو یہ بات بڑی بری لگی کہ وہ جس آدمی سے محبت کرتی ہے وہ پکنک میں اس کے ساتھ شامل ہونے کی بجائے اکیلا ہی راوی میں بوٹنگ یعنی کشتی رانی کرتا رہا تھا۔

"لیکن ہم یہاں تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

چیری ذرا سا مسکرایا۔ اس نے نجمی کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور گھاس پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔

"ہائی چیری!"

ایمی نے پیچھے سے آکر چیری کے شانے پر زور سے ہاتھ مارا۔

"ہائی ایمی!"

اتنا کہہ کر چیری پھر سگریٹ بنانے میں مشغول ہو گیا اتنے میں نسٹی نے ایمی کو دور سے آواز دی وہ گھاس پر روحی کے ساتھ دوڑ لگا رہی تھی۔ ایمی یاہو کا نعرہ لگا کر نسٹی کی جانب بھاگ اٹھی۔ نجمی کا ادھیڑ عمر کا باپ جو ریلوے میں انجینئر تھا ذرا پرے درخت سے ٹیک لگائے اپنی عیسائی بیوی کے ساتھ بیٹھا اورنج پیتے ہوئے رمی کھیل رہا تھا۔

"تم مجھے بالکل محبت نہیں کرتے۔ یو آر اے فول۔"

نجمی نے اتنا کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ چیری سگریٹ سلگا کر کش لگا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بہتے کی مہک دریا کی طرف سے آنے والی ہوا اور تمباکو کی خوشبو نے اسے ان لوگوں سے

بہت دور کر رکھا تھا۔ پھر بھی چونکہ آدمی بڑا ہوشیار تھا۔ نجمی کی بات پر بولا۔

"دنیا میں صرف بیوقوف ہی محبت کر سکتے ہیں نجمی۔ یہی وجہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"تم جھوٹے ہو۔ اگر محبت ہوتی تو دریا پر جانے کی بجائے سیدھے یہاں آتے ——"

"مجھے دریا سے بھی محبت ہے۔"

"شٹ اپ۔"

"ونڈر فل ——"

میں اب تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔ ایمی مجھ سے اتنی محبت کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے صرف تمہاری خاطر کبھی لفٹ نہیں دی۔ اور تم ہو کہ مجھے ہمیشہ تنگ کرتے ہو۔

"اگر تھوڑی سی ایمی کو بھی لفٹ دیدو تو آخر کیا حرج ہے؟ بڑا سمارٹ لڑکا ہے۔"

"آئی سے شٹ اپ۔"

"ارے پرسوں تمہارا برتھ ڈے ہے۔؟"

"تمہیں اس سے کیا؟"

"میں تمہارے لیے بہت اچھا پریزنٹ لاؤں گا۔"

کیا لاؤ گے؟ نجمی نے خوش ہو کر کہا۔

"میں خود آؤں گا۔"

"پلیز مذاق نہ کرو۔ بتاؤ ناں کیا پریزنٹ لاؤ گے؟"

"تم پرسوں خود ہی دیکھ لینا۔"

اتنے میں درخت کے اوپر کوئل کی کوک سنائی دی۔ چیری کا دل اس کی آواز پر ایک انجانی خوشی سے لبریز ہو گیا۔ اس نے سگریٹ منہ میں لیے ہی لیے آنکھیں بند کر لیں اور چہرے پر گہری خاموشی اور تھکاوٹ کا سایہ سا چھا گیا۔ نجمی اس کی ان باتوں سے بڑی چڑتی تھی۔ وہ غصے میں اٹھ کر چلی گئی اور سامنے والے پلاٹ میں جا کر چیری کو جلانے کے لیے ایمی کے ساتھ مل کر کھیلنے لگی۔ چیری نے ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا اور دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اسے یہ سب لوگ کٹھ پتلیاں سی لگیں جو کسی چھپے ہوئے ہاتھ کے اشاروں پر اپنے آپ ہی ادھر ادھر حرکت کر رہی ہوں۔ اگر کسی وجہ سے ڈوری ٹوٹ جائے تو بے جان ہو کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گر پڑیں گی۔

نجمی کی ساگرہ پر بڑی رونق لگی تھی۔

نجمی کا گھر یعنی کوٹھی ـــــ بوگار ڈن کے عقب میں واقع تھی۔ چھوٹی سی کوٹھی تھی جس کی کھڑکیوں پر گلابی پھولوں والی ولایتی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے ستونوں پر بجلی کے قمقموں کی رنگین لڑیاں جگمگا رہی تھیں۔ بڑے کمرے میں مہمانوں کا ہجوم تھا۔ فضا روشنیوں سے بقعہ نور بنی تھی قسم قسم کے سینٹ کی خوشبوؤں سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی۔ نجمی نے بڑا بھڑکیلا اور چست لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت اور صحت مند دکھائی دے رہی تھی۔ نیلی نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک آگئی تھی۔ چیری اندر داخل ہوا تو اسے دیکھ کر نجمی نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور دوسرے ہاتھ سے تحفے کا ڈبہ سنبھال لیا۔

نجمی نے فوراً ڈبہ کھول دیا۔ وہ سفید موتیوں کی مالا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"چیری تم کتنے سویٹ ہو۔"

ایمی جو قریب ہی کھڑا تھا نجمی کی اس بات پر جل اٹھا۔ مگر کیا مجال جو اس کے چہرے کی مسکراہٹ میں ذرہ برابر بھی فرق آیا ہو۔ اس رات دوسرے مہمانوں نے تو چائے اور سرد مشروبات نوش جاں کیے مگر ایمی، نجمی اور چیری نے وائن پی۔ جب ساگرہ کا ہنگامہ ختم ہوا تو یہ لوگ ایپری وائن کے سرور میں سرشار تھے۔ ایمی نشی کو لے کر اور چیری نجمی کو لے کر کوٹھی کے عقبی باغ میں ٹہلنے لگے۔ یہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کھڑکیوں میں سے آنے والی روشنی صرف دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ ایک بار یوکلپٹس کے درخت کے قریب سے گذرتے ہوئے نجمی کو اندھیرے میں منہ چومنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ ایمی اور نشی قریب ہی بیٹھے ہیں۔ چیری کو یہ آواز بے حد پیاری لگی۔ اس نے نجمی کی کمر میں بازو حمائل کر دیا اور اسے ایک دوسرے درخت کی اوٹ میں لے گیا۔ دونوں وائن کے سرور میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دونوں کے دل خوشی کی اتھاہ اور شیریں لہروں پر بن پتوار کشتیوں کی طرح ڈول رہے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے پوری طرح باخبر تھے اور ایک دوسرے

UrduPhoto.com

ایک حرکت کا منتظر تھے۔

اندھیرے میں آتے ہی چیری اپنی محبوبہ یعنی نجمی سے لپٹ گیا اور بار بار اس کا منہ چومنے لگا۔

"اوچ ـــ تم میرا میک اپ خراب کر رہے ہو چیری!"

UrduPhoto.com

"تم مجھے سپاٹل کر رہی ہو نجمی ـــ"

"کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

"کم آن ڈارلنگ۔"

اور چیری ایک بار پھر نجمی سے لپٹ گیا۔ نجمی کے بدن میں گرم خون نے آن گنت پوشیدہ امنگوں کو بیدار کر دیا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو کر تپنے لگے۔ لیکن جیسا کہ اس قسم کی لڑکیاں ہمیشہ اپنے جذبات پر قابو رکھتی ہیں اور اتنی آسانی سے بہک نہیں جاتیں، نجمی نے بھی فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور چیری کو ذرا سا پرے دھکیل دیا۔

"پلیز ڈارلنگ ـــ"

"تو تو چیری ـــ یو آر اے فول۔"

چیری نے بھی بڑی نشیلی آواز اور عاشقانہ لہجے میں نجمی سے اظہار عشق شروع کر دیا۔

"تم دنیا کی پہلی عورت ہو نجمی ـــ میں دنیا کا پہلا مرد ہوں۔ ہم دونوں پہلی بار اس جنگل کے اندھیرے میں مل رہے ہیں۔ تمہاری نیلی آنکھوں میں سمندر ہے، اور میری کالی آنکھوں میں تاریک راتوں کی پراسرار آوازیں ہیں۔ ہمارا ملاپ قدرت کا بہت بڑا منشا ہے۔ ہمیں قدرت نے آج کی رات اوھا دی ہے۔ اگر ہم نے اپنا حساب بے باق نہ کیا تو کل دن کی روشنی میں ہم قدرت کو کیا جواب دیں گے؟ نجمی! نجمی! میں تمہارا عاشق ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

نجمی نے سر پیچھے ڈال رکھا تھا اور وہ اسے نیم جاں مچھلی کی طرح ادھر ادھر ہلا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے چیری کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نو نو چیری ـــ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"یہ محبت کی گھڑی ہے نجمی ـــ رات دوڑی چلی جا رہی ہے۔ آؤ! اس تاریک ویرانے میں ایک پل کے لیے آرزوؤں کے چراغ روشن کر لیں۔ نجمی ـــ ڈارلنگ ....."

نجمی ایک دم تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"پہلے مجھ سے شادی کرو۔"

چیری نے ایک گہرا سانس لیا اور درخت سے لگ کر اندھیرے میں ہی سگریٹ بنانے لگا۔ اسے یوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا جیسے پیرس کی نائٹ کلب میں بیٹھے بیٹھے وہ اچانک گوالمنڈی کی گلیوں میں آنکلا ہو۔ یہ کیسی لڑکیاں ہیں جو محبت کی تکمیل کے لیے شادی کا پاسپورٹ حاصل کرنا ضروری خیال کرتی ہیں۔ رومان لڑانے میں یورپ کی لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں لیکن ایک خاص حد سے ذرا آگے بڑھیے تو فوراً مشرقی عورتوں کی طرح سٹ کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری بک بک محض اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ نجمی نے محبت کرنے کا یہ بے باک انداز اپنی عیسائی ماں سے لیا ہے اور شادی کا رقیانوسی تخیل اور عصمت کا تصور اس نے باپ سے پایا ہے۔ چیری کو اس بے ہنگم ملاپ پر سخت غصہ آنے لگا۔ گوالمنڈی اور پیرس کا یہ امتزاج اسے عجیب مضحکہ خیز محسوس ہوا۔ آدمی یا تو گوالمنڈی میں رہے اور یا پیرس میں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ پیرس کا ڈنر سوٹ پہنے آدمی گوالمنڈی کی گلیوں میں گھوم رہا ہے اور گوالمنڈی کی پگڑی اور تہمد باندھے پیرس کی نائٹ کلب میں بیٹھا ہے۔

"اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی تم شادی سے پہلے کی شادی پر یقین نہیں رکھتیں؟ کتنی احمقانہ بات ہے کہ تم ایک ایسے شخص سے اپنا آپ چرا رہی ہو جو تم سے محبت کرتا ہے اور ایک ایسے بیوقوف کے لیے اس کی حفاظت کر رہی ہو جس سے تم کبھی محبت نہیں کر سکو گی۔ جو تمہارے لیے بالکل اجنبی ہوگا۔ جو تم سے بالکل ایسا ہی سلوک کرے گا جو ایک بھوکا آدمی کھانے کی میز پر کرتا ہے۔ نجمی ڈارلنگ! شادی اور یہ زمانہ جہالت کی دانستہ میں پارٹنر ہو چکی ہیں۔ تم ایسی عورتوں کو کیا کہو گی جو شادی کے روز تک باعصمت رہتی ہیں لیکن شادی کے بعد دوسرے مردوں سے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیتی ہیں؟ کیا ان سے وہ عورتیں بہتر نہیں ہیں جو شادی سے پہلے جی بھر کر عشق بازی کرتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد صرف اپنے خاوند کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ نیچر کے ہاں ایسا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں اس کے اصولوں میں کہیں شادی کے جاہلانہ بندھن کا سراغ ملتا ہے۔ وہ آزاد ہے اور ہر شے کو آزادی اور بے نیازی کا درس دیتی ہے۔ ہمیں ان زنجیروں کو توڑ کر نیچرل فضا میں صرف محبت اور محبت کے لیے زندہ رہنا چاہیئے۔ یہ کیا بکواس ہے کہ ایک عورت ساری عمر کے لیے ایک ہی مرد کی ہو کر رہ جائے۔ خواہ وہ گنجہ ہو، گندا ہو، کانا ہو، لنگڑا ہو۔ یہ زندگی کو نفی کرنے والا فعل ہے اور جو چیز زندگی کی

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

نفی کرے وہ غیر قدرتی ہے۔ تکلیف کا باعث ہے اور زندگی کے میدان میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے، کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ ہر مرد کی آواز ہے۔ ہر خاوند کی آواز ہے لیکن ہم لوگ نام نہاد مجلسی نظام کی اخلاقی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ دل کی بات زبان پر نہیں لا سکتے۔ ہم نے اپنی ہر زنجیر پر سونے کا پترا چڑھا کر اسے بڑے بڑے دلفریب نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً شادی، اولاد کی محبت، بیوی کی محبت ——— میں ان سب باتوں سے آزاد ہو کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان تمام زنجیروں کو توڑ دیا ہے۔ میں تم لوگوں کے بنائے ہوئے کسی اخلاقی ضابطے کو تسلیم نہیں کرتا۔ تم سب لوگ ڈرپوک ہو۔ بزدل ہو۔ دوسروں سے نہیں اپنے آپ سے ڈرتے ہو ——— کیا ایسا نہیں ہے؟"

چیری نے آگے بڑھ کر نجمی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نجمی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ چیری نے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوڑ دیا۔ سگریٹ گھاس پر پھینک کر پاؤں تلے روندا اور اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ نجمی کو وہ اندھیرے میں تھوڑی دور تک دکھائی دیا پھر وہ غائب ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد باہر پختہ سڑک پر رات کی خاموشی میں چیری کے جوتوں کی آواز سنائی دی اور پھر آہستہ آہستہ رات کے سناٹے میں گم ہو گئی۔ نجمی کچھ دیر تو چپ چاپ سی ہو کر کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے اپنا لباس درست کیا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا رومال سے ہونٹوں کی لپ سٹک کو ٹھیک کیا اور اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ وہ چیری کی باتوں سے مرعوب ضرور ہو گئی تھی اور اگر اس وقت وہ نجمی کا ہاتھ نہ جھٹکتا تو شاید اسے اپنی آغوش میں بالکل بے بس پاتا۔ کیا عجیب انسان ہے اس کی باتوں میں کس بلا کی کشش ہے۔ نجمی کا دل اس کی ایک ایک بات پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا ذہن اسے اس کی ہر بات کے خلاف برسرِ پیکار کر رہا تھا۔ سٹوڈنٹ ذہن! بہرحال وہ چیری کی باتوں کو احمقانہ سمجھتی تھی اور مشرقی روایات اور اخلاق کے ضابطوں پر قائم تھی اور اسی پر قائم رہنا چاہتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سماوار کی ہوس کا شمار شہر کے بہترین چائے خانوں میں ہوتا ہے۔

چمکیلا فرش، ڈسٹمپر کی ہوئی دیواریں، صاف ستھری میزیں، باوردی بیرے، خوشبودار تازہ پتی کی چائے اور مناسب دام — لیکن یہاں بہت ہی کم ایسے گاہک آتے ہیں جو کہیں کام پہ جاتے ہوئے یا کسی کام سے واپس آتے ہوئے محض گھڑی دو گھڑی ستانے کی خاطر یہاں بیٹھ کر چائے سے لطف اندوز ہوں۔ حقیقت میں یہ جگہ عادی چائے پینے والوں باتیں کرنے والوں، شعر سنانے والوں، ادب کے تالاب کو گندا کرنے والوں اور جی بھر کر بور کرنے والوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں یا ایک ایک دو دو کر کے سر شام آتے ہیں اور جب سماوار کا منیجر ہوٹل بند کرنے لگتا ہے تو بمشکل یہ لوگ باہر نکلتے ہیں۔ ان میں شادی شدہ بھی ہیں، بیوی کی جستجو میں ٹھوکریں کھانے والے بھی ہیں، کبھی نہ ملی ہوئی محبوباؤں کی یادیں آہیں بھرنے والے بھی ہیں، ماں باپ کے سر پہ سوار ہو کر زندہ رہنے والے بھی۔ بہنوں کے گلے توڑ کر پیسے لانے والے بھی ہیں، کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہوشیار بھی ہیں اور سینکڑوں ہیں کہ ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ نقاد ہیں، شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، پینٹر ہیں، کلرک ہیں، بچوں کے باپ ہیں اور چند ایک محض سامعین ہیں۔ یہاں باتیں بنانے والے ہیں تو باتیں سننے والے بھی ہیں۔ ان کا کام ہمہ تن گوش ہو کر محض باتیں سنتے چلے جانا ہے کچھ پلّے پڑے یا نہ پڑے ان سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو ہر بات کی تردید کرنا جانتے ہیں۔ ہر بات کی تردید کریں گے اور جو بات سمجھ میں بالکل نہ آئے اس کی تردید تو یہاں بڑے زور شور سے کی جاتی ہے۔

مثلاً مسٹر ابلق ہیں۔ ایک کالج میں اردو پڑھاتے ہیں۔ انگریزی، فارسی اور اردو ادب سے بڑا لگاؤ ہے

کسی زمانے میں گیت لکھا کرتے تھے بھاری بھرکم ہیں۔ گردن بیل کی مانند موٹی تازی ہے سر پہ بالوں کا گھنا جنگل اُگا ہے۔ عمر چالیس کے قریب ہے۔ بڑے کند ذہن، فبی، اور سنگ دل ہیں۔ بیوی کو طلاق دے کر اپنے دونوں لڑکے حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ انگریزی اور ایرانی ادب کے مصنفوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس طرح کوئی لوہار اپنے اوزاروں کا ذکر کرتا ہے۔ عین محفل میں رومال ناک پر رکھ کر اس زور سے ناک صاف کریں گے کہ معلوم ہوگا کسی دیہاتی لاری کا ہارن بج اٹھا ہے، میرا بائی، کبیر اور سلطان باہو کے اشعار بڑی رقت پیدا کر کے آنکھیں بند کر کے گنگنائیں گے جس طرح کوئی ہٹا کٹا فقیر جھوٹ موٹ آنسو بھر کر حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا قصہ بیان کرے اور لوگوں سے پیسے بٹور لے۔

مسٹر جبی کولا ہیں۔ آپ کھاتے پیتے گھرانے سے ہیں اور اسے خوب کھا پی رہے ہیں۔ چال ڈھال ولایتی ہے لہجہ امریکیوں جیسا ہے چہرہ افریقیوں کی یاد دلاتا ہے اور تصویریں فرانسیسیوں کی نقالی میں بناتے ہیں۔ سر پہ کالے بال لہریالے ہیں اور بناوٹی معلوم ہوتے ہیں۔ درمیان سے مانگ نکالتے ہیں۔ کار نہیں ہے لیکن کار کی باتیں بہت کرتے رہتے ہیں۔ اس ہوس کے بہلاوے کے لیے چابیوں کا چھلا ہاتھ میں لیے ہر وقت گھماتے رہتے ہیں۔ تصویریں روغنی بناتے ہیں اور جدید ترین آرٹ سے کام لیتے ہیں جس میں صرف ہاتھ سے کام لیا جاتا ہے۔ دماغ سے بالکل نہیں۔ اگر اتفاق سے کینوس پہ بلّی بن جائے تو اس کے سر پہ سینگ بنا کر نیچے لکھ دیتے ہیں "عورت غسل خانے میں" کبھی سر کے بال بڑھا لیتے ہیں کبھی ڈاڑھی رکھ لیتے ہیں اور پھر منڈوا دیتے ہیں۔ دیسی گھی اور دیسی فلموں سے سخت نفرت ہے صبح پنیر کھاتے ہیں اور رات کو راک اینڈ رول کی امریکی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ایلوس پریسلے اور ٹامی سٹیل آپ کے پسندیدہ گائیک ہیں۔ مسٹر ابلق کے منہ سے میرا بائی یا کبیر داس کے بھجن سننا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ اگر کبھی کان میں ان کا کوئی دوہا پڑ جائے تو دیا سلائی کان میں پھیر پھیر کر کان کا برا حال کر لیتے ہیں۔

"ابلق تم موچی دروازے کے پہلوان ہو۔ تم بوگس ہو اور تمہارے یہ مسٹر بھگت کبیر اور مس میرا بائی دونوں بوگس ہیں۔"

ابلق میز پہ مکا مار کر کہتا ہے۔

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم ڈل آدمی ہو۔ سینکی ہو۔ تمہیں اپنے کپڑوں کی کیا خبر؟ تم پنیر کھاؤ اور اکسٹرا رول کرو ——"

مسٹر جی کو لا کی شکل تو کوکا کولا کی بوتل سے بڑی ملتی جلتی ہے۔ لیکن جی کو لا کو کوکا کولا بھی نہیں۔ گرمیوں میں وہ بیئر کی ایک بوتل پی کر کپڑے اتار دیتا ہے اور کمرہ بند کر کے سٹول پر بیٹھ کر تصویر بنانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اس طرح سکون ملتا ہے۔ ابلق کا خیال ہے کہ اگر وہ گرمیوں میں شکار کھیلنے کے بجائے بازار میں بھی آ جائے تو اس سے بہتر تصویریں بنا سکتا ہے۔

اس منڈلی کے شاعر کا نام مسٹر بور کی ہے۔ مسٹر بور کی غزل کے شاعر ہیں۔ چہرے مہرے سے مریض معلوم ہوتے ہیں۔ موٹے اور بھدے خدوخال۔ کھوے ایسی چال، چھوٹے بازو، کلچہ سے بھلجے ہاتھ، چھوٹا سا رومال چھوٹے سے بٹوے میں رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا سر صرف قراقلی کی ٹوپی پہننے کے لیے اور آنکھیں صرف عینک لگانے کے لیے بنائی ہیں۔ ذہن کا غبی پن ان کے چہرے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ شاگردوں کی پوری ٹولی بنا رکھی ہے۔ جو انہیں ہوٹل میں آتا دیکھ کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک لڑکی سے پاک محبت کرتے تھے لڑکی ایک ناپاک محبت کرنے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی یاد میں پوری چھ غزلیں کہیں اور چھ ہزار بار لوگوں کو سنائیں اور ابھی تک سنا رہے ہیں۔ کرسی پر اُدھ بلاؤ کی طرح جم کر بیٹھتے ہیں۔ کیا مجال جو ذرا بھی ہل بلا جائیں۔ دور سے بالکل مینڈک دکھائی دیتے ہیں۔ غزل کا مزاج نہیں پایا مگر عرصہ بارہ سال سے غزل کہہ رہے ہیں۔ شعر سناتے وقت آپ انھیں کہیں یا نہ کہیں وہ ہر شعر کو دو بار ضرور سنائیں گے اور اگر آپ نے کہیں بھولے سے "بہت خوب" کہہ دیا تو پھر سائنڈ بکس کی سوئی اسی ایک شعر پر اٹک جائے گی۔

مسٹر چانکیہ ہیں۔ چوڑے جبڑے، فراخ نتھنے، گول سر، ناٹا قد —— باگھ بلے کی طرح ہاتھ ہلاتے سماوار ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی نشست پہ آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کتابیں میز کے ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ ملتے ہیں اور ادھر اُدھر آنکھیں نچا کر پوچھتے ہیں۔

"کچھ سنا دوستو [illegible] کیا؟"

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

سب کا منہ کھلا رہ جاتا ہے۔ ابلق ناک کا بارن بجا کر کہتا ہے۔

"مگر اتنی جلدی؟ ابھی تو ان کا رومان ہی شروع ہوا تھا۔"

جی ہاں —— مگر یہ ایٹم کا زمانہ ہے بابا جی —— اور پھر عورت مرد سے ڈر لگے تو کون صبر کرتا ہے۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

چانکیہ عورت کا ذکر ہمیشہ سوقیانہ انداز میں کرتا ہے۔ اس کے منہ سے عورت کا ذکر سن کر عورت سے کراہت سی ہو جاتی ہے۔ مہاتما اس منڈلی کے ایک خاموش رکن ہیں۔ بڑے کالج میں ایم اے اقتصادیات کے سٹوڈنٹ ہیں۔ آپ بہت کم گو ہیں۔ اکثر خاموش رہتے ہیں۔ چائے کی دوسری پیالی پینے کے بعد سگرٹ تھام لیتے ہیں اور ناک سے دیر تک سوں سوں کرتے رہتے ہیں۔ مس گاگل جو ہمیشہ آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے رکھتی ہے ان کی ہم جماعت ہے۔ دونوں کے رومان کا کالج میں بڑا چرچا ہے۔ یہ لڑکی مہاتما ہی کی طرح سوکھی ساکھی اور چڑچڑی سی ہے۔ جسم پر سوائے ہڈیوں اور کپڑوں کے اور کچھ نہیں۔ زیادہ دیر تک کرے تو منہ خشک ہو جاتا ہے۔ سانس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور ہونٹوں کے کنارے جھاگ سے بھر جاتے ہیں۔ شاید اسے مہاتما کی خاموشی سے محبت ہو گئی ہے وہ سماوار کے اوپر والے کیبن میں بیٹھی چڑچڑ باتیں کیے جاتی ہے اور مہاتما اس کے سامنے چپ چاپ بیٹھا سر کو تھامے ناک سے سوں سوں کرتا رہتا ہے۔ جس دن چانکیہ نے یہ سکینڈل چھوڑا اسی دن یہ خبر سب متعلقہ لوگوں کو معلوم ہو گئی۔ بعد میں تپہ چلا کہ شادی وادی بالکل نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی چانکیہ نے پینترا بدل لیا اور ایک ایک سے مل کر حیرت کا اظہار کرتا۔

"یار لوگ بھی کیسی کیسی ہوائیاں چلاتے ہیں۔"

چانکیہ بہت بڑا سکینڈل باز ہے۔ سکینڈل اس کا من بھاتا کھاجا ہے۔ جب تک وہ دن میں دو تین سکینڈل نہ چھوڑ لے تین چار کی پیٹھ پیچھے برائیاں نہ کر لے اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یہ حرکتیں وہ قصداً نہیں بلکہ عادتاً کرتا ہے۔ اسے کسی سے ذاتی دشمنی نہیں اور نہ ہی کسی سے ذاتی محبت ہے۔ وہ تو بس اپنی جبلت کے مطابق اسی فعل کو سرانجام دیتا ہے۔ آپ افسانہ نویس ہیں اور پی۔ ڈبلیو ڈی کے محکمہ میں سینئر کلرک ہیں۔ شادی شدہ ہیں اور چار بچوں کے باپ ہیں۔

مسٹر ہیپو کریٹس سے بھی ملئے ——!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ پہلے اشتراکی تھے اور آج کل اسلام کے طرفدار ہیں، پہلے اسلام کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیا کرتے تھے اور آج کل اسلامی سماجی نظام کو ہر اعتبار سے برتر اور اعلیٰ ترین ثابت کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ اس موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے سماوار میں پانی بھرتے بھرتے ایکسٹرا ہیلپر کو حکم دیا تھا کہ کتاب چودہ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔

ہیپوکریٹس نے بڑی گرم جوشی سے سگریٹ چائے کی پیالی میں مسل کر ٹھنڈی کی اور گھونٹ بھرا۔

"جی تم سچی ہو۔ تمہیں نہ اشتراکیت کا کچھ پتہ ہے نہ اسلام کا۔ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو علم اور جہالت دونوں سے محروم کر رکھا ہے۔"

ویسے ہیپوکریٹس بڑا زمانہ ساز آدمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے خود نہ اشتراکیت کا پورا علم ہے اور نہ اسلام سے واقفیت ہے۔ یہ ایک فیشن ایبل سیاسی موقع پرست ہے جسے قوم کے نام پر لوگوں کو ورغلانے اور ان کے پیسے کھانے کا چسکہ پڑ گیا ہے۔ اشتراکی پارٹی سے یہ نظریاتی اختلاف کی وجہ سے الگ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اسے ان لوگوں نے خود نکال باہر کیا تھا۔ کیونکہ یہ ایک دیہاتی علاقے میں چندہ جمع کرنے گیا اور سارا چندہ ہضم کر گیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ دیہات والوں میں اسلامی نظریات کا بڑا زور ہے اور یہ لوگ صرف مسلمان ہیں اور اسلام ہی کو پسند کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف ایک جملہ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ جب پارٹی نے اسے باہر نکال دیا تو یہ فوراً ایک مذہبی جماعت میں شامل ہو گیا۔ بورکی اس کی خوب خبر لیا کرتا ہے۔

"کہنے کو موقع پرست ہے۔ تو نے اس مذہبی جماعت کو بھی بدنام کر رکھا ہے۔"

"تم بجا ارشاد کرتے ہو۔ تم دوسرے کو بھی اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ پاکستان کو مجھ ایسا سماجی کارکن کبھی نہیں مل سکتا۔ میں اس ملک کی خوشحالی کا طلبگار ہوں۔ تم لوگ محض شاعر ہو محض وقت ضائع کرنے والے ہو۔ قوم کو شاعروں کی نہیں مجھ ایسے خادموں کی ضرورت ہے۔ میں زندہ اور کام کرنے والوں میں سے ہوں۔ سماجی کارکن زندہ باد۔"

"شٹ اپ۔ اگر تم میرے آرام میں خلل ڈالو گے تو میں تمہاری ایک تصویر بناؤں گا۔ ایبسٹریکٹ تصویر بناؤں گا۔ میں ایک چمگادڑ کو بھیڑ کی پشت سے چمٹا ہوا

دکھاؤں اور نیچے تمہارا نام لکھ دوں۔"

"تم لوگ میری سوشل حیثیت سے حسد کرتے ہو اور کچھ نہیں۔"

"واہ رے میرے نپولین بوناپارٹ" جمی طنز کے انداز میں کہتا۔

"اچھا یہ بتاؤ چائے کون منگوا رہا ہے؟" ہیپوکریٹس کی اس بات پر قہقہہ لگا کر سب ہنس پڑتے اور مسٹر ابلق فوراً کسی نہ کسی انگریزی یا فرانسیسی طنز نگار کے حوالے سے کوئی جملہ جڑ دیتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ سیاستدان قوم کے جسم پر چڑھی ہوئی چیونٹیاں ہیں اور پھر وہ مال ناک پر رکھ کر زور سے ہارن بجاتا۔

آپ مسٹر سندھو ہیں۔ آپ لاہور ہی کے رہنے والے ہیں، عمر پینتیس کے قریب ہے، ہیٹ سٹیل گرے ورسٹڈ کی پتلون اور دوگھوڑا بوسکی کی قمیض پہنتے ہیں۔ لاہور کی ایک مشہور کاروباری سڑک پر جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جہاں دوپہر کے بعد استراحت کے لیے پلنگ بچھا رکھا ہے۔ دکان پر جو لڑکی بھی آتی ہے اسے پھنسانے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ تین چار لڑکیوں سے معاشقے چل رہے ہیں۔ ہر گاہک لڑکی سے بڑی لجاجت اور انتہائی شیریں لہجے میں نکریں جھکا کر باتیں کرتے ہیں۔ کیا مجال جو ذرا بھی آنکھ اٹھا کر اسے دیکھ لیں۔ یہ ظاہرداری کی شرافت اور میٹھی چاپلوسی اصل میں وہ زبردست جال ہے جس میں جب ایک بار کوئی لڑکی پھنس جاتی ہے تو پھر ساری عمر نہیں نکل سکتی۔ مسٹر سندھو خدا کا نام لے کر اسے جال سمیت اٹھا کر عقبی کمرے میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ مچھلی کی طرح بس تڑپتی ہی رہ جاتی ہے۔ جوتوں میں ساٹھ فیصد تک منافع کماتے ہیں اور دن میں نہ جانے کتنی بار جھوٹ بول کر گاہکوں کو یقین دلاتے ہیں کہ انھیں اس مال میں روپے میں صرف ایک پیسے کی بچت ہو رہی ہے۔ اپنے دونوں بچوں کو انگریزی سکول میں داخل کروا رکھا ہے۔ یہ بچے گھر میں صبح سر پہ رومال باندھ کر مولوی صاحب سے عربی کا درس لیتے ہیں اور اسکول میں نیلی جیکٹ پہن کر بابا بلیک شیپ کی گردان کرتے ہیں۔ اسکول میں جب وہ اپنی عیسائی استانیوں سے عربی کے بارے میں کوئی بات کرتے ہیں تو وہ انھیں ڈانٹتی ہیں اور گھر میں جب وہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں تو ماں ان کی سرزنش کرتی ہے۔ ماں انھیں امی جان کہنا سکھلا رہی ہیں اور باپ ڈیڈی کہلوائے جانے پر زور دیتا ہے۔ مسٹر سندھو کو پاکستان سے بے حد عقیدت ہے۔ اگر کوئی دوست کسی دوسرے ملک کی

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا جیسے پیری کی نائٹ کلب میں بیٹھے بیٹھے وہ اچانک گوالمنڈی کی گلیوں میں آنکلا ہو۔ یہ کیسی لڑکی ہے
محبت کی تکمیل کے لیے شادی کا پاسپورٹ حاصل کرنا ضروری خیال کرتی ہیں۔ رومان لڑانے میں یہ
ایکٹرسوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں لیکن ایک خاص حد سے ذرا آگے بڑھیے تو فوراً مشرقی عورتوں کی طرح
سمٹ کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری بک بک محض اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ مجھ سے
محبت کرنے کا یہ بے باک انداز اپنی عیسائی ماں سے لیا ہے اور شادی کا دقیانوسی تخیل اور عصمت کا
تصور اس نے باپ سے پایا ہے۔ پیری کو اس بے ہنگم ملاپ پر سخت غصہ آنے لگا۔ گوالمنڈی اور
کا یہ امتزاج اُسے عجیب مضحکہ خیز محسوس ہوا۔ آدمی یا تو گوالمنڈی میں رہے اور یا پیرس میں۔
عجیب بات ہے کہ پیرس کا ڈنر سوٹ پہنے آدمی گوالمنڈی کی گلیوں میں گھوم رہا ہے اور گوالمنڈی کی
پگڑی اور تہمد باندھے پیرس کی نائٹ کلب میں بیٹھا ہے۔

"اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی تم شادی سے پہلے کی شادی پر یقین نہیں رکھتیں؟ کتنی احمقانہ
بات ہے کہ تم ایک ایسے شخص سے اپنا آپ چرا رہی ہو جو تم سے محبت کرتا ہے اور ایک
ایسے بیوقوف کے لیے اس کی حفاظت کر رہی ہو جس سے تم کبھی محبت نہیں کر سکو گی۔ جو
تمہارے لیے بالکل اجنبی ہوگا۔ جو تم سے بالکل ایسا ہی سلوک کرے گا جو ایک بھوکا آدمی
کھانے کی میز پر کرتا ہے۔ نجمی ڈارلنگ! شادی اور یہ زمانہ، جہالت کی دانستہ میں پارینہ
ہو چکی ہیں۔ تم ایسی عورتوں کو کیا کہو گی جو شادی کے روز تک باعصمت رہتی ہیں لیکن
شادی کے بعد دوسرے مردوں سے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیتی ہیں؟ کیا ان
سے وہ عورتیں بہتر نہیں ہیں جو شادی سے پہلے جی بھر کر عشق بازی کرتی ہیں۔ لیکن شادی
کے بعد صرف اپنے خاوند کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ نیچر کے ہاں ایسا کوئی تصور نہیں ہے
اور نہ ہی ہمیں اس کے اصولوں میں کہیں شادی کے جاہلانہ بندھن کا سُراغ ملتا ہے۔
وہ آزاد ہے اور ہر شے کو آزادی اور بے ریائی کا درس دیتی ہے۔ ہمیں ان زنجیروں
کو توڑ کر نیچرل فضا میں صرف محبت اور محبت کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ یہ کیا بکواس
ہے کہ ایک عورت عمر بھر کے لیے ایک ہی مرد کی ہو کر رہ جائے۔ خواہ وہ گنجہ ہو،
گندا ہو، کانا ہو، لنگڑا ہو۔ یہ زندگی کو نفی کرنے والا فعل ہے اور جو چیز زندگی کی

نفی کرے وہ غیر قدرتی ہے۔ تکلیف کا باعث ہے اور زندگی کے میدان میں اس کا کوئی
مقام نہیں ہے، کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ ہر مرد کی آواز ہے۔ ہر خاوند کی آواز ہے لیکن ہم لوگ
نام نہاد مجلسی نظام کی اخلاقی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ دل کی بات زبان
پر نہیں لا سکتے۔ ہم نے اپنی ہر زنجیر پر سونے کا پترا چڑھا کر اسے بڑے بڑے دلفریب
نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً شادی، اولاد کی محبت، بیوی کی محبت ——— میں ان سب باتوں
سے آزاد ہو کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان تمام زنجیروں کو توڑ دیا ہے۔ میں تم
لوگوں کے بنائے ہوئے کسی اخلاقی ضابطے کو تسلیم نہیں کرتا۔ تم سب لوگ ڈرپوک ہو۔ بزدل
ہو۔ دوسروں سے نہیں اپنے آپ سے ڈرتے ہو ——— کیا ایسا نہیں ہے؟"

پیری نے آگے بڑھ کر نجمی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نجمی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ پیری نے اس کا ہاتھ جھٹک
کر چھوڑ دیا۔ سگریٹ گھاس پر پھینک کر پاؤں تلے روندا اور اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا کوٹھی سے
باہر نکل گیا۔ نجمی کو وہ اندھیرے میں تھوڑی دور تک دکھائی دیا پھر وہ غائب ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد باہر
پختہ سڑک پر رات کی خاموشی میں پیری کے جوتوں کی آواز سنائی دی اور پھر آہستہ آہستہ رات کے سناٹے
میں گم ہو گئی۔ نجمی کچھ دیر تو چپ چاپ سی ہو کر کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے اپنا لباس درست کیا۔
بالوں پر ہاتھ پھیرا، رومال سے ہونٹوں کی لپ سٹک کو ٹھیک کیا اور اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ وہ پیری کی
باتوں سے مرعوب ضرور ہو گئی تھی اور اگر اس وقت وہ نجمی کا ہاتھ نہ جھٹکتا تو شاید اسے اپنی آغوش
میں بالکل بے بس پاتا۔ کیا عجیب انسان ہے اس کی باتوں میں کس بلا کی کشش ہے۔ نجمی کا دل اس
کی ایک ایک بات پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا ذہن اسے اس کی ہر بات کے خلاف برسرِ پیکار کر رہا
تھا۔ سٹوپڈ ذہن! بہرحال وہ پیری کی باتوں کو احمقانہ سمجھتی تھی اور مشرقی روایات اور اخلاق کے ضابطوں
پر قائم تھی اور اسی پر قائم رہنا چاہتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سماوارٹی ہاؤس کا شمار شہر کے بہترین چائے خانوں میں ہوتا ہے۔

چکیلا فرش، ڈسٹمپر کی ہوئی دیواریں، صاف ستھری میزیں، باوردی بیرے، خوشبودار تازہ پتی کی چائے اور مناسب دام — لیکن یہاں بہت ہی کم ایسے گاہک آتے ہیں جو کہیں کام پہ جاتے ہوئے یا کسی کام سے واپس آتے ہوئے محض گھڑی دو گھڑی ستانے کی خاطر یہاں بیٹھ کر چائے سے لطف اندوز ہوں۔ حقیقت میں یہ جگہ عادی چائے پینے والوں باتیں کرنے والوں، شعر سنانے والوں، ادب کے تالاب کو گندا کرنے والوں اور جی بھر کر بور کرنے والوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں یا ایک ایک دو دو کر کے سر شام آتے ہیں اور جب سماوار کا منیجر ہوٹل بند کرنے لگتا ہے تو بمشکل یہ لوگ باہر نکلتے ہیں۔ ان میں شادی شدہ بھی ہیں، بیوی کی جستجو میں ٹھوکریں کھانے والے بھی ہیں، کبھی نہ ملی ہوئی محبوباؤں کی یاد میں آہیں بھرنے والے بھی ہیں، ماں باپ کے سر پہ سوار ہو کر زندہ رہنے والے بھی۔ بہنوں کے گلے توڑ کر پیسے لانے والے بھی ہیں، کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہوشیار بھی ہیں اور سینکڑوں ہیں کہ ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ نقاد ہیں، شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، پینٹر ہیں، کلرک ہیں، بچوں کے باپ ہیں اور چند ایک محض سامعین ہیں۔ یہاں باتیں بنانے والے ہیں تو باتیں سننے والے بھی ہیں۔ ان کا کام ہمہ تن گوش ہو کر محض باتیں سنتے چلے جانا ہے کچھ پلّے پڑے یا نہ پڑے اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو صرف تردید کرنا جانتے ہیں۔ ہر بات کی تردید کریں گے اور جو بات سمجھ میں بالکل نہ آئے اس کی تردید تو بڑے زور شور سے کی جاتی ہے۔

مثلاً مسٹر ابلق ہیں۔ ایک کالج میں اردو پڑھاتے ہیں۔ انگریزی، فارسی اور اردو ادب سے بڑا لگاؤ ہے

کسی زمانے میں گیت لکھا کرتے تھے بھاری بھرکم ہیں۔ گردن بیل کی مانند موٹی تازی ہے۔ سر پہ بالوں کا گھنا جنگل اُگا ہے۔ عمر چالیس کے قریب ہے۔ بڑے کند ذہن، غبی، اور سنگ دل ہیں۔ بیوی کو طلاق دے کر اپنے دونوں لڑکے حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ انگریزی اور ایرانی ادب کے مصنفوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس طرح کوئی لوہار اپنے اوزاروں کا ذکر کرتا ہے۔ عین محفل میں رومال ناک پہ رکھ کر اس زور سے ناک صاف کریں گے کہ معلوم ہوگا کسی دیہاتی لاری کا ہارن بج اٹھا ہے، میرا بائی، کبیر اور سلطان باہو کے اشعار بڑی رقت پیدا کر کے آنکھیں بند کر کے گنگنائیں گے۔ جس طرح کوئی ہٹا کٹا فقیر جھوٹ موٹ آنسو بھر کر حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا قصہ بیان کرے اور لوگوں سے پیسے بٹور لے۔

مسٹر جی کو لائیں۔ آپ کھاتے پیتے گھرانے سے ہیں اور اسے خوب کھا پی رہے ہیں۔ چال ڈھال ولایتی ہے لہجہ امریکیوں جیسا ہے چہرہ افریقیوں کی یاد دلاتا ہے اور تصویریں فرانسیسیوں کی نقالی میں بناتے ہیں۔ سر پہ کالے بال لہرا رہے ہیں اور بناوٹی معلوم ہوتے ہیں۔ درمیان سے مانگ نکالتے ہیں۔ کار نہیں ہے لیکن کار کی باتیں بہت کرتے رہتے ہیں۔ اس ہوس کے بھلاوے کے لیے چابیوں کا چھلا ہاتھ میں لیے ہر وقت گھماتے رہتے ہیں۔ تصویریں روغنی بناتے ہیں اور جدید ترین آرٹ سے کام لیتے ہیں جس میں صرف ہاتھ سے کام لیا جاتا ہے۔ دماغ سے بالکل نہیں۔ اگر اتفاق سے کینوس پہ بلّی بن جائے تو اس کے سر پہ سینگ بنا کر نیچے لکھ دیتے ہیں "عورت غسل خانے میں"۔ کبھی سر کے بال بڑھا لیتے ہیں کبھی ڈاڑھی رکھ لیتے ہیں اور پھر منڈوا دیتے ہیں۔ دیسی گھی اور دیسی فلموں سے سخت نفرت ہے صبح پنیر کھاتے ہیں اور رات کو راک اینڈ رول کی امریکی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ایلوس پریسلے اور ٹامی سٹیل آپ کے پسندیدہ گائیک ہیں۔ مسٹر ابلق کے منہ سے میرا بائی یا کبیر داس کے بھجن سننا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ اگر کبھی کان میں ان کا کوئی دوہا پڑ جائے تو دیا سلائی کان میں پھیر پھیر کر کان کا برا حال کر لیتے ہیں۔

"ابلق تم موچی دروازے کے پہلوان ہو۔ تم بوگس ہو اور تمھارے یہ مسٹر بھگت کبیر اور مس میرا بائی دونوں بوگس ہیں۔"

ابلق میز پہ مکا مار کر کہتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم نرالی آدمی ہو سینکی، ہو تمہیں اپنے کپڑوں کی، اپنی پرسنری کی کیا فکر؟ تم پنیر کھاؤ اور مزے کرو۔"

مسٹر جی کرلا کی تمسی کو کو کرلا کی برتی سے بڑی ملتی جلتی ہے۔ لیکن جی کو لا کو کو کرلا بالکل نہیں نہیں۔ گرمیوں میں وہ بیئر کی ایک بوتل پی کر کپڑے اتار دیتا ہے اور کمرہ بند کر کے سٹول پر بیٹھ کر تصویر بنانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اس طرح سکون ملتا ہے۔ ابلق کا خیال ہے کہ اگر وہ فلم میں نگار بننے کے بجائے بازار میں بھی آجائے تو اس سے بہتر تصویریں بنا سکتا ہے۔

اس منڈلی کے شاعر کا نام مسٹر بور کی ہے مسٹر بور کی غزل کے شاعر ہیں۔ چہرے مہرے سے مریضانہ معلوم ہوتے ہیں۔ موٹے اور بھدے خدوخال۔ کھوسے ایسی چال، چھوٹے بازو، کلپھ سے لجلجے ہاتھ، چھوٹا سا رومال چھوٹے سے ٹوسے میں رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا سر صرف قراقلی کی ٹوپی پہننے کے لیے اور آنکھیں صرف عینک لگانے کے لیے بنائی ہیں۔ ذہن کا غبی پن ان کے چہرے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ نیاگرا کی پوری ٹولی بنا رکھی ہے۔ جوانیں ہوٹل میں آتا دیکھ کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک لڑکی سے پاک محبت کرتے تھے لڑکی ایک ناپاک محبت کرنے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی یاد میں پوری چھ غزلیں کہیں اور چھ ہزار بار لوگوں کو سنائیں اور ابھی تک سنا رہے ہیں۔ کرسی پر اودبلاؤ کی طرح جم کر بیٹھتے ہیں۔ کیا مجال جو ذرا بھی ہل جلا جائیں۔ دور سے بالکل مینڈک دکھائی دیتے ہیں۔ غزل کا مزاج نہیں پایا مگر عرصہ بارہ سال سے غزل کہہ رہے ہیں۔ شعر سناتے وقت آپ انہیں کہیں یا نہ کہیں وہ ہر شعر کو دو بار ضرور سنائیں گے اور اگر آپ نے کہیں بھولے سے "بہت خوب" کہہ دیا تو پھر سائنس کی سوئی اسی ایک شعر پر اٹک جائے گی۔

مسٹر چانکیہ ہیں۔ چوڑے چکلے، فراخ ماتھے، گول مرنا تا قدر — باگڑ بلے کی طرح ہاتھ ملتے سماوار ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی نشست پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ کتابیں میز کے ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ ملتے ہیں اور ادھر اُدھر آنکھیں نچا کر پوچھتے ہیں۔

"کچھ سنا دیدی تو؟"

"مہاتما نے مس گاگل سے شادی کر لی۔"

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

سب کا منہ کھلا رہ جاتا ہے۔ ابلق ناک کا بارن بجا کر کہتا ہے۔

"مگر اتنی جلدی؟ ابھی تو ان کا رومان ہی شروع ہوا تھا۔"

جی ہاں — مگر یہ ایٹم کا زمانہ ہے بابا جی — اور پھر عورت مزے دار ملے تو کون صبر کرتا ہے۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

چانکیہ عورت کا ذکر ہمیشہ سوقیانہ انداز میں کرتا ہے۔ اس کے منہ سے عورت کا ذکر سن کر عورت سے کراہت سی ہو جاتی ہے۔ مہاتما اس منڈلی کے ایک خاموش رکن ہیں جو کالج میں ایم اے اقتصادیات کے سٹوڈنٹ ہیں۔ آپ بہت کم گو ہیں۔ اکثر خاموش رہتے ہیں۔ چائے کی دوسری پیالی پینے کے بعد سگرٹ لیتے ہیں اور ناک سے دیر تک سوں سوں کرتے رہتے ہیں۔ مس گاگل جو ہمیشہ آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے رکھتی ہے اُن کی ہم جماعت ہے۔ دونوں کے رومان کا کالج میں بڑا چرچا ہے۔ یہ لڑکی مہاتما ہی کی طرح سوکھی ساکھی اور چمڑ مخ سی ہے۔ جسم پر سوائے ہڈیوں اور کپڑوں کے اور کچھ نہیں۔ زیادہ دیر تک بات کرے تو منہ خشک ہو جاتا ہے۔ سانس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور ہونٹوں کے کنارے جھاگ سے بھر جاتے ہیں۔ شاید اسے مہاتما کی خاموشی سے محبت ہو گئی ہے وہ سماوار کے اوپر والے کیبن میں بیٹھی چپڑ چپڑ باتیں کیے جاتی ہے اور مہاتما اس کے سامنے چپ چاپ بیٹھا سر کو تھامے ناک سے سوں سوں کرتا رہتا ہے۔ جس دن چانکیہ نے یہ سکینڈل چھوڑا اسی دن یہ خبر سب متعلقہ لوگوں کو معلوم ہو گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ شادی وادی بالکل نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی چانکیہ نے پینترا بدل لیا اور ایک ایک سے مل کر حیرت کا اظہار کرتا۔

"یار لوگ بھی کیسی کیسی ہوائیاں چلاتے ہیں۔"

چانکیہ بہت بڑا سکینڈل باز ہے۔ سکینڈل اس کا من بھاتا کھاجا ہے۔ جب تک وہ دن میں دو تین سکینڈل نہ چھوڑے، تین چار کی پیٹھ پیچھے برائیاں نہ کرے اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یہ حرکتیں وہ قصداً نہیں بلکہ عادتاً کرتا ہے۔ اسے کسی سے ذاتی دشمنی نہیں اور نہ ہی کسی سے ذاتی محبت ہے۔ وہ تو بس اپنی جبلت کے مطابق اسی فعل کو سرانجام دیتا ہے۔ آپ افسانہ نویس ہیں اور پی۔ ڈبلیو ڈی کے محکمہ میں سینئر کلرک ہیں۔ شادی شدہ ہیں اور چار بچوں کے باپ ہیں۔

مسٹر ہیپو کریٹس سے بھی ملئے —!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ پہلے اشتراکی تھے اور آج کل اسلام کے طرفدار ہیں، پہلے اسلام کے خلاف دھواں دھار تقریریں
کیا کرتے تھے اور آج کل اسلامی سماجی نظام پر ہر اعتبار سے برتر اور اعلیٰ ترین ثابت کرنے میں رطب
اللسان رہتے ہیں۔ آپ اس موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے سماوار میں بیٹھے بیٹھے ایک دن یہ ارادہ
کر دیا تھا کہ کتاب چودہ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔

ہپوکریٹس نے بڑی گرم جوشی سے سگریٹ چائے کی پیالی میں مسل کر جمی کو لاکو مکا دکھایا۔

"جمی تم سیکی ہو۔ تمھیں نہ اشتراکیت کا کچھ پتہ ہے نہ اسلام کا۔ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں
کو علم اور جہالت دونوں سے محروم کر رکھا ہے۔"

ویسے ہپوکریٹس بڑا زمانہ ساز آدمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے خود نہ اشتراکیت کا پورا علم
ہے اور نہ اسلام سے واقفیت ہے۔ یہ ایک فیشن ایبل سیاسی موقع پرست ہے جسے قوم کے نام پر
لوگوں کو ورغلانے اور ان کے پیسے کھانے کا چسکہ پڑ گیا ہے۔ اشتراکی پارٹی سے یہ نظریاتی اختلاف
کی وجہ سے الگ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اسے ان لوگوں نے خود نکال باہر کیا تھا۔ کیونکہ یہ ایک دیہاتی علاقے
میں چندہ جمع کرنے گیا اور سارا چندہ ہضم کر گیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ دیہات والوں میں اسلامی
نظریات کا بڑا زور ہے اور یہ لوگ صرف مسلمان ہیں اور اسلام ہی کو پسند کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف
ایک جملہ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ جب پارٹی نے اسے باہر نکال دیا تو یہ فوراً ایک مذہبی
جماعت میں شامل ہو گیا۔ بورکی اس کی خوب خبر لیا کرتا ہے۔

"کیلئے تو موقع پرست ہے۔ تو نے اس مذہبی جماعت کو بھی بدنام کر رکھا ہے۔"

"تم بجوا اس کرتے ہو۔ تم دوسرے کو بھی اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ پاکستان کو مجھ
ایسا سماجی کارکن کبھی نہیں مل سکتا۔ میں اس ملک کی خوشحالی کا طلبگار ہوں۔ تم لوگ محض
شاعر ہو۔ محض وقت ضائع کرنے والے ہو۔ قوم کو شاعروں کی نہیں مجھ ایسے خادموں کی
ضرورت ہے۔ میں زندہ اور کام کرنے والوں میں سے ہوں۔ تم مردہ اور بے حس لوگوں میں سے
ہو۔ سماجی کارکن زندہ باد۔"

UrduPhoto.com

"اچھا اب جاؤ۔ جاؤ۔ آؤ تو میرے سٹوڈیو میں آؤ تو میں تمھاری ایک
تصویر بناؤں۔ ایبسٹریکٹ تصویر بناؤں۔ میں ایک چمگادڑ کو بھیڑ کی پشت سے چمٹا ہوا

دکھاؤں اور نیچے تمھارا نام لکھ دوں۔"

"تم لوگ میری سوشل حیثیت سے حسد کرتے ہو اور کچھ نہیں۔"

"واہ رے میرے نپولین بوناپارٹ" جمی طنز کے انداز میں کہتا۔

"اچھا یہ بتاؤ چائے کون منگوا رہا ہے؟" ہپوکریٹس کی اس بات پر قہقہہ لگا کر سب
ہنس پڑتے اور مسٹر ابلق فوراً کسی نہ کسی انگریزی یا فرانسیسی طنز نگار کے حوالے سے کوئی
جملہ جڑ دیتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ سیاستدان قوم کے جسم پر چڑھی ہوئی چیونٹیاں
ہیں اور پھر رومال ناک پر رکھ کر زور سے ہارن بجاتا۔

آپ مسٹر سندھور ہیں۔ آپ لاہور ہی کے رہنے والے ہیں، عمر پینتیس ۳۵ کے قریب ہے۔ ہمیشہ سٹیل
گرے ورسٹڈ کی پتلون اور دو گھوڑا بوسکی کی قمیض پہنتے ہیں۔ لاہور کی ایک مشہور کاروباری سڑک
پر جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جہاں دوپہر کے بعد استراحت کے
لیے پلنگ بچھا رکھا ہے۔ دکان پر جو لڑکی بھی آتی ہے اسے پھنسانے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ تین
چار لڑکیوں سے معاشقے چل رہے ہیں۔ ہر گاہک لڑکی سے بڑی لجاجت اور انتہائی شیریں لہجے میں نظریں
جھکا کر باتیں کرتے ہیں۔ کیا مجال جو ذرا بھی آنکھ اٹھا کر اسے دیکھ لیں۔ یہ ظاہرداری کی شرافت اور میٹھی چاپلوسی
اصل میں وہ زبردست جال ہے جس میں جب ایک بار کوئی لڑکی پھنس جاتی ہے تو پھر ساری عمر نہیں نکل
سکتی۔ مسٹر سندھور خدا کا نام لے کر اسے جال سمیت اٹھا کر عقبی کمرے میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ
مچھلی کی طرح بس تڑپتی ہی رہ جاتی ہے۔ جوتوں میں ساٹھ فیصد تک منافع کماتے ہیں اور دن میں نہ
جانے کتنی بار جھوٹ بول کر گاہکوں کو یقین دلاتے ہیں کہ انھیں اس مال میں روپے میں صرف ایک پیسے کی
بچت ہو رہی ہے۔ اپنے دونوں بچوں کو انگریزی سکول میں داخل کروا رکھا ہے۔ یہ بچے گھر میں صبح
سر پہ رومال باندھ کر مولوی صاحب سے عربی کا درس لیتے ہیں اور سکول میں نیلی جیکٹ پہن کر بابا
بلیک شیپ کی گردان کرتے ہیں۔ اسکول میں جب وہ اپنی عیسائی استانیوں سے عربی کے بارے میں
کوئی بات کرتے ہیں تو وہ انھیں ڈانٹتی ہیں اور گھر میں جب وہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں تو ماں ان
کی سرزنش کرتی ہے۔ ماں انھیں امی جان کہنا سکھلا رہی ہیں اور باپ ڈیڈی کہلوائے جانے پر زور
دیتا ہے۔ مسٹر سندھور کو پاکستان سے بے حد عقیدت ہے۔ اگر کوئی دوست کسی دوسرے ملک کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعریف کردے تو آپ اس سے لڑائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ جناح کیپ پہنتے ہیں۔ ہمارے
مسٹر چنار کا خیال ہے کہ پاکستان کو بدنام کرتے ہیں ان لوگوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔

رستہ ہو۔ تم قمیض دو گھوڑا بوسکی کی پہنتے ہو لیکن دماغ میں عقل ایک گھوڑے جتنی
بھی نہیں رکھتے۔ تم پاکستان کے نادان دوست ہو۔ خدا اس ملک کو تم ایسے لوگوں سے بچائے

سنہ ہوتے چنار کو پھر اچھا کھانا شروع کر دیا۔ چنار ہنستا رہا اور سگریٹ بناتا رہا
جس عورت تیز ہو چلے تو بیمار کے دوست کے بیٹے آنا جانا شروع کر دیتے ہیں۔

یادش بخیر ڈاکٹر ہومیو کا گھر شہر کے اندر ایک پرانے محلے میں تھا۔
پرانا محلہ ہم نے اس لیے کہا ہے کہ وہاں تقریباً سبھی مکان سکھوں کے عہد کی یادگار تھے۔ ڈاکٹر
ہومیو کے مکان کی ڈیوڑھی ٹھنڈی، اندھیری اور لمبی تھی مگر مکان اندر سے کافی بڑا تھا۔ کمروں کی چھتیں
نیچی تھیں مگر وہ کافی فراخ تھے۔ ہمارے ہیرو چنار کو اس سہ منزلہ مکان کی سب سے نچلی منزل میں
نشست گاہ کے ساتھ والا اچھوتا سا کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ایک پلنگ، تپائی، دو کرسیاں اور ایک
چھت کا جالا صاف کرنے والا بانس تھا۔ ایک مدت سے بیکار پڑا رہنے کے باعث اس بانس کے
برش پر مکڑیوں نے جالا بن رکھا تھا۔ ڈاکٹر ہومیو کے گھر میں ادب اور آرٹ کا بڑا چرچا تھا۔ یعنی خود ڈاکٹر
ہومیو یونان کے فلاسفر پیتاگورس اور ایران کے جمشید کا عاشق تھا۔ بیگم چائے کی پیالی لے کر بیٹھ جاتی اور
اپنا سلسلۂ نسب کشمیر کے ایک پرانے شاعر سے ملا دیتی جس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر
چائے دانی اس کے ساتھ ہی دفن کی جائے۔ بڑا لڑکا جاسوسی ناولوں کا عاشق تھا۔ چھوٹے لڑکے پر
اسلامی تاریخی ناولوں نے حملہ کر رکھا تھا۔ تیسری جماعت والی لڑکی اختر رومانوی اور جیوں کی کتابیں
سرہانے رکھ کر سوتی اور بڑی لڑکی زلیخا عرف زلفی پھول پتوں سے اتنی واقفیت جتاتی کہ کوئی
مالی بھی کیا جتائے گا۔ اسے شاعروں سے بڑی محبت تھی۔ بعد میں چنار کو پتہ چلا کہ ایک شاعر کی وجہ
سے گرفتار ہو کر وہ لاہور کے ایک فیشن ایبل حجام کی دکان کے عقبی کمرے میں اسے ملنے جایا کرتی
تھی۔ چنار نے جب گھر میں علم و ادب کی یہ فراوانی دیکھی تو سمجھ گیا کہ اس گھر میں اور چڑیا گھر میں کوئی
زیادہ فرق نہیں ہے۔ پہلے ہی روز جب شام کو وہ سب کے ساتھ مل کر چائے پینے کمرے میں آیا تو

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زلفی نے کٹی ہوئی زلف ماتھے پر لہرا کر موتیے کے چند ایک پھول چپکے سے چنار کے ہاتھ میں تھما دیئے۔
محبت کرنے کا یہ رومانوی اور دورِ شجاعت کا سا انداز اسے بے حد مرغوب تھا لیکن یہاں وہ اسے بالکل
نہ جچا۔ اس کا دل میں ماتھا ٹھنکا کہ یہ لڑکی محض فراڈ ہے اور دکھاوے کی رومانوی بن رہی ہے۔ بعد میں یہ بات
ثابت بھی ہو گئی کہ زلفی کو محض رومانوی بننے کے شوق میں ہی پھولوں سے اُنس تھا۔ پھولوں کی خوشبو
اور اس خوشبو کے انسانی ذہن پر ردِ عمل سے اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو حیران ہو گیا کہ ہر
لڑکی چنے کی دال کا آدھا دیگچہ چاولوں کی تھالی پر ڈال کر چٹ کر جاتی ہے۔ وہ پھولوں سے بھی
پیار کرتی ہے۔ پھر کئی بار ایسا ہوا کہ زلفی نے پھول سونگھتے ہوئے یا کسی شاعر کی نظم سناتے ہوئے
اتنے زور سے ڈکار کہ تپائی پر پڑی چائے کی پیالی تک کانپ گئی۔ زلفی کو جب سے یہ معلوم ہوا
تھا کہ چنار کسی زمانے میں افسانے بھی لکھتا رہا ہے اور آج کل وہ سمادار نامی ہوٹل میں شاعروں اور
ادیبوں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ وہ اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ بڑی بن سنور کر چنار کے سامنے بیٹھا
کرتی۔ بالوں کی لٹ ماتھے پر ہوتی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ ہوتا۔ آنکھیں مسکا مسکا کر بات کرتی۔
کبھی منہ تک آئے ہوئے بے ہنگم قہقہے کو اندر ہی اندر دبا کر چھوٹی سی مسکراہٹ بنا دیتی اور کبھی
خاموش رہنے والی بات پر یونہی ادائے مسکرا دیتی۔

چنار کو پہلے ہی روز اس بے معنی لڑکی سے نفرت ہو گئی تھی اس لیے کہ اس نے اس پھولوں
کی شیدائی عورت کے بغل میں آیا ہوا پسینہ دیکھ لیا تھا جس نے قمیض کو استینوں تک شرابور کر رکھا تھا
چنار کو زلفی سے انتہائی کراہت محسوس ہوئی۔ اس کے باوجود چنار نے زلفی سے محبت شروع کر
دی یعنی رومان لڑانا شروع کر دیا۔ کیونکہ چنار اپنی خواہشات کا تابعدار تھا۔ بڑا ہوس پرست
اور دل پھینک عاشق تھا۔ ہر لڑکی پر عاشق ہو جانا اور پھر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش
کرنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔ وہ زلفی سے عشق بھی کرتا رہا۔ اور نفرت بھی کرتا رہا۔
نفرت کی گہری آنچ تو اس وقت پلٹ پلٹ جاتا۔ اپنا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا دیتا تاکہ
اس کی شکل نہ دکھائی دے سکے۔ عشق کا کچا آتا تو اس کی چھوٹی بہن اختر سے آنکھیں لڑانی شروع
کر دیتا۔ [illegible] تین قسم کی لڑکی تھی۔ یعنی اس قسم کی لڑکیوں میں
جن کے معاشقے عام طور پر شادی کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ جن کو محلے کے اور گھر کے

سکول تک پیچھا کرنے والے ایک ایک لونڈے کی پوری پوری خبر ہوتی ہے لیکن جو کسی کی طرف آنکھ
اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں لیکن اگر کہیں کسی کے جال میں آ جائیں تو پھر تمام ناکردہ گناہوں کے بدلے چکا دیتی ہیں۔
چنار نے دو ایک بار اختر سے آنکھیں لڑانے کے جتن کیے مگر اس کی دال نہ گلی۔ اور وہ اسے بالکل
ہی بھلا بیٹھا۔ گویا اس گھر میں اختر نامی کسی لڑکی کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ زلفی سے اس کی جھوٹی محبت بدستور
جاری رہی۔ ایک رات کیا ہوا کہ گھر میں سوائے زلفی کی ماں اور ایک عدد بڑے بھائی کے اور کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر
ہومیو صاحب مرغ اڑانے اختر اور بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی بیٹی کے ہاں منٹگمری گئے ہوئے تھے چنار
رات گئے سمادار ہوٹل سے واپس آیا۔ کھانا اس نے وہیں کھا لیا تھا۔ پورا کھانا نہیں —— یہی ایک عدد
چانپ اور گیارہ سلائس یعنی ڈبل روٹی کے ٹکڑے —— اپنے کمرے میں آ کر اس نے کپڑے بدلے۔ بدلے
کیا —— بس کپڑے اتار دیئے۔ لحاف میں گھس کر پلنگ کی پٹی سے چمٹا ہوا بلب جلایا اور ریلوے ٹائم ٹیبل
کا تھوڑا بہت مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ رات کو ہمیشہ برہنہ سوتا اور ریلوے ٹائم ٹیبل
کا تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کرتا۔ کبھی خیبر میل میں اور کبھی پسنجر میں بیٹھ کر ایک ایک سٹیشن کا نام بڑے غور سے
پڑھتا پھر اس بات کا بھی حساب رکھتا چلا جاتا کہ وہ کتنے میل کی مسافت طے کر آیا ہے اور ابھی کتنا سفر باقی
ہے۔ اسی طرح پڑھتے پڑھتے، گاڑی میں دھکے کھاتے کھاتے جب اسے نیند آ جاتی تو وہ سو جاتا۔ اگر
ملتان کے سٹیشن پر نیند آتی تو وہ گاڑی وہی ٹھہرا دیتا اور اگلے روز پھر وہیں سے سفر کرتا۔

آج وہ ٹنڈو آدم سے روانہ ہوا تھا اور ابھی ٹنڈو جام تک ہی پہنچا تھا کہ دروازے
کا کواڑ آہستہ سے کھلا اور زلفی ماتھے پر کٹی ہوئی زلف ڈالے اندر آ گئی۔

"زلفی تم؟"

"جی ہاں۔"

"اس وقت؟"

"میں نے سوچا دن کو تو آپ میری بات نہیں سنتے۔ اب رات کو ہی ملا جائے۔"

چنار نے ریلوے ٹائم ٹیبل ایک طرف رکھ دیا اور لحاف کو اچھی طرح بدن کے گرد
لپیٹ کر پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ زلفی بھی اس کے قریب ہی آ کر پٹی پر بیٹھ گئی۔

"رسالہ نقوش پڑھ رہے ہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں ٹائم ٹیبل ہے۔"

"ارے؟ یہ کس لیے پڑھ رہے ہیں زلفی تم کس لیے آئی ہو؟"

زلفی نے بڑی گہری نظروں سے پلکیں جھپکا کر چنار کو دیکھا اور سر جھکا کر بولی۔

"کیا آپ نہیں جانتے؟"

"اچھا — سمجھ گیا — تو تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

"اپنے دل سے پوچھئے۔"

چنار نے جلدی سے اپنا ہاتھ زلفی کے دل پر رکھ دیا۔

"تمہارے دل سے کیوں نہ پوچھوں؟"

زلفی نے تڑپ کر چنار کا ہاتھ پرے کر دیا اور خود اور آگے ہو بیٹھی۔ اب وہ اتنی قریب آ گئی تھی کہ چنار کو اس کے پسینے کی بو صاف محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ سردیوں کا موسم تھا مگر زلفی کے خون میں بلا کا جوش تھا۔ چنار کو زلفی سے وہی پرانی کراہت یعنی نفرت کا احساس ہوا اور اس نے اپنا سر زلفی کے بازوؤں میں دے دیا۔ زلفی اس حرکت پر بہت خوش ہوئی۔ اور وہ چنار کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"مجھ سے اب تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہا جاتا میرے چنار۔ تم باہر چلے جاتے ہو اور اتنی رات گئے واپس آتے ہو۔ میں گھڑیاں گنتی رہتی ہوں۔ تم بڑے سنگدل ہو۔ تمہیں ذرا میرا خیال نہیں ہے۔"

"میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں زلفی — میں بھی تمہاری جدائی میں تڑپتا رہتا ہوں۔ ایک پل کے لیے تمہاری صورت نہ دیکھوں تو بے چین ہو جاتا ہوں۔"

"میرے چنار — میری طرف دیکھو نا! اپنا چہرہ میرے سامنے لاؤ۔"

زلفی چنار کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور چنار اپنا سر چھپا رہا تھا۔

"نہیں نہیں زلفی میں تمہارے حسن کی تاب نہیں لا سکتا۔ میں سورج سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔"

UrduPhoto.com

چنار کو اچھی طرح معلوم تھا کہ زلفی کو قریب سے دیکھتے ہی اس کا یہ گھڑی دو گھڑی کا جسمانی عشق بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ لیکن زلفی بھلا کب پیچھے ہٹنے والی تھی۔ اس نے چنار کا منہ اوپر کر ہی لیا۔ چنار کے سامنے اب چوڑے نتھنوں والی ناک تھی۔ لمبے کان تھے اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

"آہ میری آنکھیں چکا چوند ہوئی جا رہی ہیں۔ میں اس نظارے کی تاب نہیں لا سکتا۔ میں تمہاری خوبصورتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آؤ میرے پیارے ہم چھت پر چل کر محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ یہاں کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

چنار نے سوچا کہ مصیبت تو آ گئی ہے۔ وہ لحاف سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ لحاف میں سمٹ گیا۔

"نہیں نہیں زلفی ہم یہیں بیٹھ کر محبت کریں گے۔ میں بتی گل کیے دیتا ہوں۔"

اور چنار نے فوراً بتی بجھا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ارے تم تو کانپ رہی ہو۔ لو یہ لحاف اوڑھ لو۔"

چنار نے زلفی کو اپنے لحاف میں چھپا لیا۔ زلفی کی چیخ سی نکل گئی۔

"کیا آپ؟"

"ہاں زلفی — میرے پاس یہی ایک سلیپنگ سوٹ ہے۔ تم بھی سلیپنگ سوٹ پہن لو۔"

"چنار — کیا مجھ سے شادی کرو گے؟"

"وہ کیا ہوتی ہے؟"

"شادی کیا ہوتی ہے؟ بھئی شادی یعنی بیاہ ——"

"وہ تو میں ابھی کر رہا ہوں۔"

"ابھی کیسے؟ یہاں تو کوئی نکاح پڑھانے والا بھی نہیں۔"

"اس کا بندوبست پھر کبھی ہو جائے گا۔"

"نہیں میری جان — ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک پہلے نکاح نہیں ہو گا میری

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے شادی نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

"محبت کرنے۔"

"وہ کیا بلا ہوتی ہے۔"

"دو دلوں کا ملاپ۔ کشش۔"

"میں صرف ایک ہی کشش کو جانتا ہوں اور وہ کشش ثقل ہے۔ اگر مجھ سے محبت کرتی ہو تو سلیپنگ سوٹ کو پہن کر چپ چاپ سو جاؤ۔ اور اگر نکاح پڑھوانا چاہتی ہو تو کمرے میں جا کر اپنی ماں کے ساتھ سو جاؤ۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو چنار؟ میں تم سے پاک محبت کرتی ہوں۔"

"یعنی پلاٹونی محبت۔"

"ہاں پاک محبت — جس میں صرف دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے جس میں جسم بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ آسمانی محبت —"

"زلفی پر زور کریں آسمانی محبت نہیں کر سکتا۔ مجھے تم سے کبھی محبت نہ ہوتی اگر میں تمہیں نہ دیکھتا اور میں تمہیں کبھی نہ دیکھ سکتا اگر تمہارا جسم نہ ہوتا۔ تم اپنا جسم بھی ہو اور جسم کی روح بھی۔ روح بغیر جسم کے بے معنی ہے اور جسم بغیر روح کے مردہ ہے۔ ہم اتنی بڑی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟"

"نہیں نہیں چنار — ایکبار جسم کے ملاپ سے محبت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔"

"جو محبت جسم کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے وہ اسی قابل ہوتی ہے۔ حقیقی محبت جسم سے بلا حاصل کرتی ہے جسم اس کی تکمیل کرتا ہے۔ جسم کو بھلا کر کوئی انسان روح کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔ اور روح کو پس پشت ڈال کر جسم کا معراج نصیب نہیں ہو سکتا۔ آج روح اور جسم کے ملاپ کی رات ہے زلفی!

آؤ! میرے اور قریب آ جاؤ۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ چنار زلفی سے نفرت کرتا تھا مگر وہ اس کے جسم میں بڑی کشش محسوس کرتا تھا۔ جب زلفی اس کے کمرے سے باہر جانے لگی تو اس کی کٹی ہوئی زلف بکھر کر ماتھے پر جھالر سی بنا رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی چنار نے لحاف کو سمیٹ کر اوپر کیا۔ پلنگ سے ٹیک لگائی اور ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ شروع کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام ہو گئی تھی۔

سماوار ہوٹل میں کرنے والی مخصوص جگہ پر چنار کے دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ مگر چنار ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ناک میں سے بارن بجانے والا اردو کا پروفیسر ابلق، جوتے بیچنے والا گا بک لڑکیوں اور ناز کا دیوانہ سندھور، پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے والا پی ڈبلیو ڈی کا افسانہ نویس سینئر کلرک چانکیہ لور لچھے ہاتھوں والا شاعر لور کی سبھی بیٹھے تھے۔ چائے کی پیالیاں اُن کے ہاتھوں میں تھیں۔ سگریٹ آ رہے تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔

چانکیہ نے چائے کا گھونٹ لے کر سندھور کی طرف دیکھا اور ذرا جھک کر کہا۔

"کچھ تم نے بھی سنا؟"

"کیا؟" سندھور نے بھی جھک کر پوچھا۔ چانکیہ نے کہا۔

"یہ چنار آج کل مسز..... انجینئر کے ہاں بہت آتا جاتا ہے۔"

"تمہیں کس نے کہا؟"

"بس سنا ہے کہیں سے ۔۔۔ کہتے ہیں انجینئر کی بڑی لڑکی ۔۔۔۔۔"

سندھور نے فوراً بات کاٹی۔

"نجمی؟"

"ہاں ۔۔۔ نجمی سے عشق لڑایا جا رہا ہے۔"

سندھور نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"یہ خبر ابھی غلط ہے۔ عشق کا علم ہمیں کہاں سے ہونے لگا۔"

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

حقیقت یہ تھی کہ سندھور کو چنار اور نجمی کے معاشقے کی پوری خبر تھی۔ کیونکہ درپردہ وہ بھی نجمی کو چاہنے کی فکر میں تھا۔ وہ کئی بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ اور ایک بار چنار کے ساتھ اس کی دکان پر جوتے خریدنے آئی تھی۔ سندھور کی دکان کا عقبی کمرہ اس کی یاد میں بے قرار تھا۔ وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔ وہ اس مسئلے کو ہوا نہیں دینا چاہتا۔ کیونکہ اس طرح نجمی کے لیے اُس کے عشقیہ جذبات کو صدمہ پہنچتا تھا۔ مگر چانکیہ کو تو صرف سکینڈل پھیلانے سے کام تھا۔ وہ بڑبڑ اپنی دھن میں لگا رہا۔

"مگر یہ بات تو سب دوستوں کو معلوم ہو چکی ہے۔"

"کونسی بات؟" مسٹر ابلق نے رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے پوچھا۔"

چانکیہ فوراً بھولا بھالا سا بن گیا۔ اصل میں جو بات اس کے دماغ میں تھی وہ کسی دوسرے بیوقوف کی زبان سے کہلوانا چاہتا تھا۔

"یہ سندھور ہی کچھ کہہ رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہا ہے یہ گدھا؟" لور کی نے دہانہ پھیلا کر کہا۔ سندھور نے لور کی کو بڑی خوبصورت گالی دی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ چانکیہ نے دیکھا کہ اب ہر ایک کی توجہ ہو گئی ہے تو کہنے لگا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ چنار صاحب کسی نیلی آنکھوں والی لڑکی سے ۔۔۔۔۔ ہے ہے ہے؟"

"عشق کر رہا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے۔" ابلق نے جملہ مکمل کیا۔

"بھئی میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔" چانکیہ نے خوشی سے لٹک کر کہا۔

اتنے میں چنار سماوار میں داخل ہوتا نظر آیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ چانکیہ نے فوراً موضوع بدل دیا اور شاعری پر بات شروع کر دی۔ چنار وہاں آ کر بیٹھ گیا اور چائے کا آرڈر دے کر سگریٹ بنانے لگا۔ سندھور کہہ رہا تھا۔

"اگر حالی مسدس نہ لکھتا تو اُسے کوئی یاد نہ رکھتا۔ اُس نے تو صرف قوم کو بلکہ شعر کو بھی ایک نیا راستہ دکھایا۔"

چنار نے سگریٹ جلا کر کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ حالی اگر سو سال زندہ رہا تو صرف اپنی چند ایک غزلوں کی وجہ سے زندہ رہے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا مطلب؟" چانکیہ نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ غزل اصل شاعری ہے۔"

"لیکن اُس وقت اسی قسم کی شاعری کی ضرورت تھی۔"

"تم جاہل آدمی ہو۔ تم ان باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔"

"میں اتنا جانتا ہوں کہ میری جہالت نے مجھ سے ہمیشہ سیدھی اور کھری بات کہلوائی ہے۔ میں تم پڑھے لکھوں والی ریاکاری اور تصنع سے بہت دور ہوں۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔" سندھور اور رابلق نے ہم زبان ہو کر کہا۔ اتنے میں جمی کو لابھی چابیاں گھماتے ہوئے تشریف لے آئے اور فوراً بحث میں شریک ہو گئے۔

"بائی دی وے دوستو! یہ مسٹر حالی کون تھے؟"

بور کی نے مینڈک کی طرح ٹرّا کر کہا۔

"لو — یہ چنار کے ایک اور ساتھی آ گئے ہیں۔"

اب جو دیکھتے ہیں تو سیاسی چسکے باز مسٹر ہیپو کریٹس بھی جھاؤ کی طرح شانے ہلاتے تشریف لا رہے ہیں۔ پوری منڈلی جم گئی اور گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔ ادب سے بات سیاسیات میں آ نکلی ہیپو کریٹس نے ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"اس قوم کو صرف ایک مضبوط مرکز کی ضرورت ہے۔"

"اور تمھیں اگر کسی شے کی ضرورت ہے تو وہ قوم کے چندے ہیں۔"

چنار نے مسکرا کر کہا۔ ہیپو کریٹس گرم ہو گیا۔

"تم بکواسی ہو۔ تمھیں سیاست کے اسرار و رموز کی کیا خبر۔ تم ایک نراجی ہو۔ تمھارا مقام نہ دوزخ میں ہے اور نہ جنت میں۔ کیونکہ یہ ہر دو مقامات ایک خاص نظام کے تحت چل رہے ہیں۔"

"اگر تم اپنی دوزخ میں جانے والی روش پر ہی قائم رہتے تو میں تمھاری بڑی عزت کرتا۔ [illegible] تم جیسے [illegible] پر [illegible] تم خود ہی یقین نہیں رکھتے۔ اشتراکیوں کو [illegible] کہ تم نے اشتراکیت کو نقصان پہنچایا اور اب مسلمانوں کے گروپ میں شامل ہو کر اسلام کا علیہ بگاڑ رہے ہو۔" چانکیہ نے سر جھٹک دیا اور کہنے لگا۔

UrduPhoto.com

"لیکن تم بھی تو لوگوں کو دھوکا دیتے ہو۔"

"میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ بلکہ میں مکان کے باہر بیٹھ کر دھوکا دینے والے کا انتظار کرتا ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ ہمارا یار رابلق کہتا ہے کہ تم ایک لڑکی کو محبت کے سبز باغ دکھا رہے ہو۔ حالانکہ جیسا تم کہا کرتے ہو تم محبت میں بالکل یقین نہیں رکھتے۔"

"میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی اور نہ کر سکتا ہوں۔ جس لڑکی کا تم نے بڑی مکاری سے اور اپنی فطرت کے عین مطابق اظہار کیا ہے وہ خود مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"نہیں یہ دوسری بات ہے۔ محبت کرنے اور محبت کروانے میں بڑا فرق ہے۔ محبت کرنے میں انسان اپنی آدھی شخصیت دوسرے کے قدموں پر رکھ دیتا ہے اور دوسری حالت میں وہ دوسرے کی پوری شخصیت کو ہضم کر جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس لڑکی کو خراب کر رہے ہو۔ تم اسے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہ تم سے نہ ملا کرے۔"

یہ بات جوتوں والے سندھور نے کہی تھی۔ چنار فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ سندھور صاحب بھی نجمی پر ڈورے ڈال رہے ہیں۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے نزدیک دنیا کی کوئی لڑکی کبھی بھی اس حالت میں نہیں ہوتی کہ اسے خراب کیا جا سکے۔ یہ تمھارا اپنا مجرم ضمیر ہے جو تمھیں خرابی کا احساس دلاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اسے یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے نہ ملا کرے لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تم سے ملنا شروع کر دے۔"

سندھور بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔

"تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔ میں نے کبھی کسی کی بیٹی کے متعلق ایسا نہیں سوچا۔"

"اس لیے کہ تم جس شریف باپ کی بیٹی کے بارے میں ایسا سوچتے ہو اسے تم حاصل کر لیتے ہو۔ شاید یہ پہلی لڑکی ہے جس کے بارے میں تم ایسا سوچنے پر مجبور ہو گئے ہو۔"

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس بحث کے دوران سٹرابوری پر اچانک مٹھاس کے کھوے نے حملہ کر دیا تھا اور وہ کری کی پشت سے ایک لگا کر خاموش بیٹھی سے عزلی کا مطلع گنگنانے میں مشغول تھے۔

بجی کولا نے چائے کی پیالی پر چار کو پوز پیٹ بنا رہا تھا یہ ٹریٹ تیار کر کے اس نے نعرہ لگایا۔

"ہائی ٹو کس! یہ رہے چار دی گریٹ"

سب نے تصویر دیکھی۔ وہاں ہنس کی چند یک آرائی آرائی تھی بکھری ہوئی ایک بچہ کا ہوا خاکی گھوڑا جانور جس کے چہرے سے پرایک آنکھ پوری کھلی ہوئی تھی۔ بوری نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"رو ستو! بڑے صدمے کا مطلع ہو گیا ہے۔ عرض کیا ہے۔۔۔۔" پرو فیسر ابلق نے گردن جھکا کر کہا۔

"تم اپنے احمقانہ شعروں سے ہمیں بور کرنے کی بجائے میرا بائی کا ایک بھجن سنواؤ اگر تمہاری گردن پر سر ہے تو آگے بڑھو۔"

اس کے بعد پرو فیسر ابلق نے صوفے پر زور ڈال کر گردن کی رگیں پھلا کر بڑے دلسوز آواز میں رک رک کر میرا بائی کا یہ بھجن گانا شروع کر دیا۔

ہے ری میں تو پریم دیوانی — میرا درد نہ جانے کو
سوئی اوپر سیج ہماری — کسی بدھ سونا ہو
گگن منڈل پر سیج پیا کی — کسی بدھ ملنا ہو
میرا درد نہ جانے کو

گی گی کی گت گا گی جانے — یا جن گا گی ہو
جواہر کی گت جواہر جانے — یا جن جواہر ہو
میرا درد نہ جانے کو

نہ بیا کو
سانوریا ہو
میرا درد نہ جانے کو

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

چنار کو یہ بڑی مضحکہ خیز سی بات لگی کہ پروفیسر ابلق ایسا بھاری بھرکم آدمی درد کے بارے گانے والے کو تانا جھنگلی بن ادھر ادھر ڈول رہا ہے۔ اسے ایک ایسے سانڈ کا خیال آیا جو پیٹ کے درد کے مارے زمین پر اٹا لیٹا ٹانگیں چلا رہا ہو۔

ہیپو کریٹس نے کہا۔

"اس گیت میں ہمیں اس دور کی لوئر کلاس کی معاشی بدحالی کا سراغ ملتا ہے۔ میرا بائی اس دور کی بہت بڑی انقلابی شاعرہ تھی۔"

چنار سگریٹ بناتے ہوئے زیر لب مسکراتا رہا۔ بجی کولا نے کہا۔

"میرا بائی اگر ماڈرن ائیج میں پیدا ہوتی تو بڑے ڈیڈرنل نظمی گیت لکھتی۔"

سندر صوصاحب بولے۔

"اس تمام گیت میں سوائے خدا کی محبت کے اور کچھ نہیں۔"

چنار نے ہنس کو کہا۔

"اس لیے کہ تمہیں بھی اس دنیا میں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

بوری بولا۔

"کیا خوب مصرعے کے بعد مصرعہ آیا ہے اس کا کوئی دیوان نہیں چھپا کیا؟"

"وہ مسودہ لے کر ایک پبلشر کے پاس گئی تو ضرور تھی مگر رائلٹی پر بات نہیں ہو سکی۔"

چنار کی اس بات پر سندر صوا اور ہیپو کریٹس قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ ابلق نے ایک اور بھجن سنانے کا ارادہ کیا تو چنار نے کہا۔

"تم اب معاف ہی کرو تو اچھا ہے۔ ایک تو تم بھجن سناتے ہو اور پھر گا کر سناتے ہو حقیقت یہ ہے کہ تمہیں بھجن گاتے سن کر مجھے اور میرا بائی دونوں کو صدمہ پہنچا ہے۔ تم تو صبح اٹھ کر ڈنڈ پیلا کرو۔ ڈنڈ لگایا کرو لیکن بھجن مت گایا کرو۔ زیادہ سے زیادہ کبھی ہو گیا تو قوالی کر لیا کرو۔"

چانکیہ نے چہک کر کہا۔

"یار یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ لیکن اگر تمہاری شادی ہو گئی تو میرا خیال ہے ہمارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پروفیسر دانش فوراً ہی اختر رہ گئے۔"

پروفیسر دانش نے اختر سے کہا۔

"ارے لیے تمہارے لیے بھی اچھا شادی ہو سکتی ہے۔"

چمار نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"لیکن میں نے ایک بار شادی کر لی تو پھر اسے طلاق دے کر اس پر مقدمہ وائر نہیں کروں گا۔"

پروفیسر دانش ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں میری ذاتیات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"ہم اپنے ہر اس جرم کو جس پر لوگ انگلی اٹھا سکیں ذاتی کہہ کر گھر کی کوٹھری میں چھپا دیتے ہیں۔ جب ہماری ذات کسی دوسرے کی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے تو پھر ہمارا ہر فعل غیر ذاتی ہو جاتا ہے۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم ایک لڑکی کی زندگی برباد کر کے یہاں بیٹھ کر مجھ گاتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ اپنے گھر بیٹھی آہ بھی نہ کرے اور پھر تم اپنے اس جرم کو ذاتی مجبوریوں کے نام سے یاد کر کے اپنی کمینگی کا ثبوت بھی دیتے ہو۔ یا تو یہ کہو کہ تم نے یہ کام محض اپنی خون مزاجی کی وجہ سے کیا ہے اس لیے کہ اس عورت سے تمہارا جی بھر گیا تھا۔ تم کسی نئی عورت کی آغوش چاہتے تھے۔"

پروفیسر دانش ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"حضرات میں احتجاجاً یہاں سے واک آؤٹ کرتا ہوں۔"

جب پروفیسر دانش چلا گیا تو میز پر کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد ہیلو کرشن جی کو لابھی اٹھ کر چلے گئے۔ اب وہاں صرف چمار، چانکیہ اور بودرکی رہ گئے تھے۔ چانکیہ کو چمار کا یہ طرز عمل بڑا ناگوار گذرا تھا۔ اس نے کہا۔

"دنیا میں کوئی بات اچھی بری نہیں ہوتی بات مالو یعنی ہوتی ہے اور یا جھوٹی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے بچوں کو تعلیم نہیں کرتے۔"

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

"میرے اپنے قاعدے ہیں اور میں ان پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔"

"لیکن یہ ہمارے معاشرے میں تمہیں اس قسم کی خرافات پھیلانے کا کیا حق ہے؟" میرابات سنتو ھی نے کہی تھی۔

"ہر پاگل خانے میں ایک ڈاکٹر ضرور رہتا ہے۔"

اتنا کہہ کر چمار نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور اٹھ کر بڑے اطمینان سے باہر نکل گیا۔

میں اس وقت آسی ہوٹل کے اوپر گیلری والے کیبن میں اقتصادیات کے طالب علم مہاتما صاحب اپنی اقتصادیات کی طالبہ مس گاگل کے پہلو میں بیٹھے اس سے عشق کا اظہار فرما رہے تھے۔ مس گاگل خلاف عادت خوش تھی اور مہاتما خلاف عادت بولے جا رہے تھے۔ کیبن کے آگے پردہ گرا ہوا تھا۔ مہاتما نے مس گاگل کا خنک سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اسے کئی بار چومنے کے بعد اپنی آنکھوں سے لگا چکے تھے۔

"میں نہیں سمجھتی عورت کا ہاتھ چومنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"اس میں میرے دل کی خوشی پوشیدہ ہے مس گاگل۔"

"لیکن مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اچھا سنیے تم نے آج کے لیکچر کے نوٹس لیے ہیں؟ ذرا دکھانا تو۔"

مہاتما نے مس گاگل کا ہاتھ چھوڑ کر میز پر رکھ دیا۔ عینک آنکھوں پر جمائی اور کاپی کھول کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے بل ادا کیا اور گیلری سے نیچے اتر کر ہوٹل کے عقبی دروازے سے باہر نکل آئے۔ مال روڈ پر سے وہ کالج کے لان تک پیدل ہی چلتے رہے۔ کالج کی پرانی وضع کی پتھریلی عمارت کے ٹھنڈے برآمدوں میں سے گذر کر وہ کالج کے پچھواڑے والے لان میں آ کر نیچ پر بیٹھ گئے۔

بہار کی اس خوبصورت شام کا سورج مغرب کی جانب آم کے بلند پیڑوں کے عقب میں غروب ہو رہا تھا۔ باغ میں سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ سویٹ پیز کی جھاڑیوں میں رنگ برنگ پھول کھل رہے تھے جن کی خوشبو ہوا اڑائے لیے جا رہی تھی۔ کہیں کہیں رنگین پروں والی تتلیاں چکر لگا رہی تھیں۔ سرسبز ترشی ہوئی گھاس پر ہرے ہرے ٹڈے اچک رہے تھے۔ مس گاگل نے اقتصادیات کی ایک موٹی سی کتاب بغل میں دبا رکھی تھی۔ تھوڑی دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اچانک مس گاگل اٹھی اور آنا کہہ کر بولی "مجھے اب چلنا چاہیے۔" وہاں سے چل دی۔ مہاتما

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چپ چاپ وہاں بنچ پر بیٹھا اپنی معاشی مسائل کی نظریاتی الجھنوں میں پھنسی ہوئی محبوبہ کو اس کھلے آسمان میں چلتا دیکھتا رہا۔ آم کے درختوں میں اس کا مختصر سا سوکھا سا کھاہیولا عجیب بے ہنگم لگ رہا تھا۔ اس کی ایک روشنی گھوم کر دو نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ دھاتما نے عینک کے شیشے رومال سے صاف کیے۔ اسے دوبارہ لگایا اور اپنی کاپی کھول کر کالج کے سبق کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ایکا ایکی اسے اپنے پیچھے کسی کے بوجھل قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے گردن پھیر کر دیکھا۔ اس کے عقب میں آلوچے کے ایک چھریرے پیڑ کے پاس کھڑا ایک شاخ پر کھلے ہوئے آلوچے کے کچھ پھولوں کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم یہاں کب سے کھڑے ہو؟ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

چنار آہستہ سے چل کر اس کے پاس آ کر بنچ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جب سے آلوچے کے یہ پھول کھلے میں یہیں کھڑا ہوں۔"

دھاتما ہنس پڑا۔

"تم بھی عجیب ہو۔ لیکن پیارے تمھیں یہاں سوائے میرے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔"

"پہلے تم اپنی محبوبہ کو تو سمجھ لو۔"

"بڑی پیاری لڑکی ہے ——"

"اسی سے شادی کر لو۔ اقتصادیات کے تمام لیکچر خود بخود سمجھ میں آ جائیں گے۔"

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ میں تمھیں یہ بتانا بھول ہی گیا، کلکتے سے سچترا آئی ہوئی ہے۔ تم اسے جانتے ہو ناں۔ وہی خوبصورت سیاہ آنکھوں والی بنگالی لڑکی جو ہمارے کالج میں پڑھا کرتی تھی۔"

"آگے کہو۔"

"کل مجھے مینو میں مل گئی۔ تمھارا پوچھ رہی تھی۔"

چنار بنچ پر پاؤں لٹکے، وہیں گھر کے گھر کے سگریٹ بنا رہا تھا۔ سگریٹ بنا کر اس نے سلگایا۔ [illegible] کے پیڑ کے پاس جا کر پھولوں کا ایک گچھا توڑا اور وہاں سے چل دیا۔

UrduPhoto.com

"سچترا کے پاس۔"

"اس کا پتہ معلوم ہے کیا؟"

"میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔"

چنار کو کسی زمانے میں اس لڑکی سے محبت رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے سچترا کو اسی سماوار ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ کالی کالی آنکھیں، بھرے بھرے ہونٹ۔ اور چہرے پر ایک گہری اداسی کی لکیر جو مسکراتے ہوئے زیادہ نمایاں ہو جاتی۔ چنار اب ہر ہفتے گورداسپور سے لاہور آتا اور سچترا سے ملتا۔ سچترا کو بھی چنار سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ لیکن چنار نے اس سے کبھی اظہار محبت نہ کیا۔ بس اس سے ملتا۔ سماوار یا مرینو میں بیٹھ کر چائے، کافی وغیرہ پیتے۔ گلگتے، برد وان اور چندر نگر کی باتیں کرتے اور پھر اپنی اپنی راہ لیتے۔ سچترا ماڈل ٹاؤن میں اپنی موسی کے ہاں رہا کرتی تھی۔ تقسیم کے ہنگاموں میں وہ کلکتہ چلی گئی اور دو تین سال بعد اسے ایک مختصر سا خط ملا جس میں سچترا نے لکھا تھا کہ یہاں اس کی شادی ہو گئی۔

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچترا گاف روڈ پر اپنے پتا جی کے ایک دوست کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔

وہی گہری سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، چہرے پر ایک دل گداز سی، چپ چاپ سی اداسی، لمبے سیاہ بال مانگ میں سیندھور، پیشانی پر ٹنک، نارنجی بارڈر والی سفید سلک کی ساڑھی، کلائیوں میں سرخ چوڑیاں۔ وہ چنار کو دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ وہ اسے دس گیارہ سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ سچترا میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہ آیا تھا کہ وہ پہلے سے ذرا دبلی ہو گئی تھی اور چہرے کی اداسی میں زیادہ گہرائی اور متانت آ گئی تھی۔ چنار کو یوں لگا جیسے بنگال کے گنجان جنگلوں میں ساگوان اور نارنیل کے تاریک جھنڈوں میں موسلا دھار بارش کے بعد اچانک سنہرا سورج نکل آیا ہو اور ساگوان کے گیلے تنوں پر سونا چمکنے لگا ہو۔ جیسے وقت کے سینے پر سے گیارہ سالوں کے بھاری پتھروں کی سلیں ایک ایک کر کے اتر گئی ہوں اور جیسے کسی نے دونوں ملکوں کی بیوہ سرحد کی ویران مانگ میں محبت، خوبصورتی، امن اور مسرتوں کا سیندھور بھر دیا ہو۔ جیسے شانتی نکیتن کے سب کوار گھل گئے ہوں اور سفید و براق خوش الحان پرندے خدا کی الوہیت اور انسان کی عظمت کے گیت گاتے چاندی ایسی دھوپ میں پرواز کرنے لگے ہوں۔

سچترا! تم گلے کا ذکر کر کے میرے دل پہ تیر چلاؤ اور میں لاہور کی باتیں سنا کر تمہاری یادوں کو ابھار دیتا ہوں۔ کہو! کیا وہاں اب بھی بارش ہوتی ہے؟ کیا چندر نگر سے برد وان جانے والی لائن پر بھی بارش کے بعد سوندھی سوندھی مہک آتی ہے؟ کیا اب بھی [illegible] کیا [illegible] محبت اور خوبصورتی کا درس دیتا ہے؟ کیا

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

پچھلی رات کو اب بھی کوئی لڑکی پیپنے پر ہاتھ رکھے سانس روکے ناریل کے درختوں میں سے گذر کر پیا ملن کو جاتی ہے؟ کیا دُرگا پوجا کی شام کو اب بھی گنوری لڑکیاں مٹی کے گھڑے سر پر رکھے چل کر مندروں کو جاتی ہیں؟ کیا مسجد ناخدا کے بلند میناروں سے اب بھی صبح و شام مؤذن کی صدا بلند ہوتی ہے؟ کیا خضر پور گارڈن میں اب بھی عید کا میلا لگتا ہے؟ کیا کوئی لولا سٹریٹ اور زکریا سٹریٹ کے مکانوں میں تلاوتِ کلامِ الٰہی کی مقدس آواز سنائی دیتی ہے؟ کیا مسجدوں میں شبِ معراج کو اگر تبیاں سلگتی ہیں اور گلاب کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے؟ مجھے بتاؤ سچترا کیا بنگال ویسا ہی ہے جیسا میں چھوڑ آیا تھا۔ کیا وہ بھی تمہاری طرح تھوڑا سا کمزور تو نہیں ہو گیا۔؟ دبلا تو نہیں ہو گیا؟ اس کے چہرے کی اداسی میں بھی تو زیادہ گہرائی اور ویرانی نہیں آ گئی۔؟"

سچترا خاموش تھی۔ وہ سر جھکائے اس کے ساتھ ساتھ شالامار کی ایک پھولوں بھری روش پر چل رہی تھی۔ چنار نے ایک جگہ گلاب کا انتہائی خوبصورت پورا کھلا ہوا پھول توڑ کر سچترا کو دیا۔ اس نے پھول کو اپنے جوڑے میں لگا لیا۔ چنار نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مالی نے انھیں نہیں دیکھا تھا۔ وگرنہ بنگال کے جنگلوں اور لاہور کے حسین باغوں کا سارا رومان خاک میں مل جاتا۔

"یہ لاہور ہے سچترا۔ تمہارا اپنا شہر اور میرا وطن۔ لاہور مجھے اس شہر سے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ تمہارے بعد اگر میں نے کسی سے محبت کی ہے تو صرف لاہور سے۔ یہ بڑا گندہ اور بڑا دلفریب شہر ہے۔ یہاں ملاں حسین حلوائی کی برفی ہے، خلیفے کے کباب ہیں، باغ جناح کے دلکش اور پُرسکون کنج ہیں، مشرق کا سب سے بڑا سٹیڈیم ہے، موچی دروازہ کے روغنی نان اور بھاٹی دروازے کی پُراسرار گلیاں ہیں، صوبہ خاں کی کمر توڑ دکان ہے۔ اور مولا بخش کے دنبلاں شکن پان ہیں۔ کنال بینک کے لمبے لمبے یوکلپٹس کے درخت ہیں اور گوال منڈی کے ہوٹلوں کا شور ہے، میکلوڈ روڈ کی جگمگاتی روشنیاں ہیں، اور شملہ پہاڑی کی ٹھنڈی ہوا ہے اور شاد باغ کے آموں کے جھنڈ ہیں، آلوچے کے باغ ہیں اور ناشپاتیوں کے سفید سفید پھولوں سے لدے ہوئے درخت ہیں، میں تمہارے ملک کے ہر شہر سے پیار کرتا ہوں۔ وہاں کے لوگوں سے، اُن کے اسکول جاتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچوں سے اور ان کے پھول ایسے تر و تازہ مسکراتے ہوئے معصوم چہروں سے پیار کرتا ہوں۔
مجھے تمہارے لیڈروں سے کوئی سروکار نہیں۔ اس لیے کہ وہ متعصب ہیں، انگلستان، امریکہ کے
متلاشی ہیں اور ایسے دیوانے بھی ہیں جنھوں نے ابھی تک ہمارے ملک کو تسلیم نہیں کیا۔ میں
ٹیگور کا پرستار ہوں اور گوتم بدھ سے محبت کرنے والا ہوں اور سب سے بڑھ کر دکھی انسانیت
کی دوستی، سچائی، مظلوموں کی حفاظت اور پیغمبروں کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے قدموں میں سے ہوں۔ میں امن اور ملاپ کا نغمہ گر ہوں۔ لیکن اگر کبھی تمہارے سر پھرے
لیڈروں نے جنگ کا اعلان کر دیا تو پھر ایک حسین گن میرے ہاتھ میں بھی ہوگی۔ جس کا منہ
تمہارے سر تسر بنارس، بدھ دان اور کلکتہ کی طرف ہوگا۔ پھر میں تیر چلے پہ چڑھاتے ہوئے
ارجن کی طرح چیخ پڑوں گا نہیں۔ پھر یہ ہو گا، جنگ ہوگی، امن کے لیے، محبت کے لیے
بقا کے لیے، نشوونما کے لیے اور عزت کے لیے ـــــ اس لیے کہ مجھے لاہور کی سڑکوں
پر سکول کی طرف جانے والی بچیوں سے بھی پیار ہے ـــــ تم سن رہی ہو نا سچترا ـــــ ؟"

سچترا خاموش تھی۔ وہ سر جھکائے چلی جا رہی تھی اور گلاب کا بڑا سا کھلا ہوا پھول اس کے سیاہ
جوڑے میں جگمگا رہا تھا اور ایک بسنتی پیڈوں والی ساری اس کی اچھی چوٹی پر بیٹھنے کی کوشش کر
رہی تھی۔

اگلے روز چنار نے سچترا کو مریخ ہوٹل میں کافی پلائی۔

اس دن سچترا نے سنہرے بارڈر والی ہلکے جامنی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس کے گندمی بدن
پر بہت سج رہی تھی۔ وہ دونوں مریخ کی گیلری میں اگلی قطاروں والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ یہاں سے
انھیں نیچے ہال کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دائیں پہ بینڈ بجانے والوں نے ہال کی چھت سر پہ
اٹھا رکھی تھی۔ ان کا میوزک بالکل سرکس میوزک معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ہاتھیوں کو نچانے کے
لیے بجا رہے ہوں۔ [illegible] اونچی آوازوں میں باتیں کرتے اور جب میوزک
بند ہوتا تو وہ بھی آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتے۔ چنار کو یاد آ گیا کہ بحرین سے آئے ہوئے اس
کے ایک بارہ دوست نے ان لوگوں کو بینڈ بجاتے اور ہاکی کود مچاتے دیکھ کر کہا تھا۔

"یہ علم [illegible]

خدا خدا کر کے میوزک کا یہ کارخانہ بند ہوا اور چنار اور سچترا نے اطمینان کا سانس لیا۔ سچترا جب
چنار کے ساتھ ہال میں سے گذری تھی تو عورتیں اور مرد اسے حریفی نظروں سے دیکھنے لگے تھے ان
چھوٹے قصبے کی اعلیٰ کوٹھیوں میں رہنے والی خواتین نے سچترا کو بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا جنھیں
قیمتی سے قیمتی ساڑھیاں میسر تھیں لیکن پہننے کا سلیقہ اور ذوق نصیب نہ ہوا تھا۔ ہال میں بیٹھے
ہوئے لوگ اب بھی کسی وقت سر اٹھا کر گیلری کی جانب ان دو دوستوں کی طرف دیکھ لیتے تھے۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" سچترا نے چنار کی پیالی میں کافی انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"ایک اخبار میں کام کر رہا ہوں۔"

"شادی نہیں کی ابھی؟" سچترا نے نظریں نیچی ہی نیچی کیے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"تم نے شادی کر کے کیا پایا ہے؟"

"اپنا پتی دیو۔ پیارے بچے ـــ ایک چھوٹا سا گھر۔ رسوئی ـــ ماں کی مانند پتی
کا پیار ـــ جب وہ دفتر جانے لگتے ہیں تو میں ان کے لیے چائے بناتی ہوں اس کے
بعد بچوں کو کپڑے پہنا کر نوکر کے ساتھ سکول روانہ کرتی ہوں۔ پھر گھر بھر کو ٹھیک ٹھاک
کرتی رہوں۔ پتا کے کپڑوں کی مرمت کرتی ہوں۔ رات کو بچوں کو اپنے ساتھ لٹا کر انھیں
پریوں کی کہانیاں اور میٹھی میٹھی لوریاں سناتی ہوں۔ پھر وہ میرے ساتھ لگ کر سو جاتے ہیں۔
اور میری ساری تھکن اتر جاتی ہے، سارے فکر دور ہو جاتے ہیں۔ میں منہ اندھیرے
اٹھتی ہوں۔ نہا دھو کر پوجا میں سیندھور بھرتی ہوں۔ تلسی کے پودے کو پانی دیتی ہوں آنگن
میں چڑیوں کے لیے چاول بکھیرتی ہوں۔ رتن جوگے پھول توڑ کر درگا دیوی کے چرنوں میں
ڈالتی ہوں اور بھگوان سے اپنے پتی دیو اور بچوں کی سلامتی کی دعا مانگتی ہوں۔ اس سے
زیادہ مجھے اور کیا چاہیے۔"

"کیا تم اپنے خاوند سے کبھی بور نہیں ہوتیں؟"

سچترا ہنس پڑی اور اس کے موتیوں ایسے دانت چمک اٹھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں ہے، تم کیا کہنے لگے۔ بھلا کوئی آدمی اپنے پتی سے بڑھ بھی ہوتی ہے؟ وہ تو میرے
گھر کی روشنی ہیں، میرے ماتھ کا سہاگ ہے۔"

"کیا تم اپنے خاوند سے محبت کرتی ہو؟"

"محبت، میاں بیوی کے لیے بڑا اچھا لفظ ہے۔ محبت سے بھی بڑھ کر میں تو ان کی پوجا
کرتی ہوں۔ انھوں نے مجھے میرے پیارے بچے دیئے ہیں، میرے گھر کا سکھ دیا ہے، میرے
لیے میں ماں کی مامتا کو تیاگا ہے۔ وہ تو میرے لیے بھگوان سمان ہیں۔"

"کبھی تم نے محبت کی تھا سچترا۔"

"اچھا! مجھے یاد نہیں ——— سنو، میری چھوٹی بچی کا نام ایراوتی ہے۔ اسے بھجن گانے
کا بڑا شوق ہے۔"

"میں کالج کے دروازے پر گھنٹوں تمھاری راہ دیکھا کرتا تھا۔"

"ہاں! مجھے تم نے بتایا کیوں نہیں؟ ——— اور سنو تو ——— ایک دن ایراوتی نے کیا کیا
——— میرے سنگھار میز پر سے تیل اٹھا کر ساری بوتل اپنے بالوں میں انڈیل لی۔ میرا تو
مارے ہنسی کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تمھیں کالج کے میوزک کنسرٹ کی وہ رات یاد ہے؟ اس رات تم نے سرخ ساڑھی
پہن رکھی تھی اور تمھارے کانوں میں سیاہ پتھر کے چمکیلے بندے جگمگا رہے تھے۔ تم شعلہ بنی
سٹیج پر ناچتی گا رہی تھیں۔"

"میں تو اب بھی گاتی ہوں، مگر صرف گھر میں اور اپنے پتی دیو کے سامنے۔ تمھیں ایک
گیت سناؤں؟"

اور سچترا نے دھیمی دھیمی آواز میں بنگال کے ایک مشہور لوک گیت کے دو ٹکڑے گنگنائے۔

UrduPhoto.com

"ہری بھری دیکھ پائی اس کا چاند سا مکھڑا
ہری بھری اس سے پیار کی باتیں کر پائیں۔
کیسے بیدھے تیر سے گھائل کر دیا تو نے
او بھائی تیر انداز!"

"چکھن ششو مور کھدائے چلے
کا مدی ہے ماں ماں بلے
تارڈاک دیوتا۔ بوکے شیپیہرا باجی ہے رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے"
"جب میرا بچہ بھوک سے تڑپ اٹھے گا
ماں! ماں! کہہ کر روئے گا
اس کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں گونج اٹھے گی
کیسے بیدھے تیر سے گھائل کر دیا تو نے
او بھائی تیر انداز!"

سچترا کی آواز کچھ بوجھل سی ہو گئی اور آنکھوں میں نمی سی جھلک اٹھی۔ شاید اسے اپنے بچے یاد آ گئے
تھے جو کلکتے میں تھے۔ اگرچہ اب وہ ماں کا دودھ نہیں پیتے، لیکن ماں تو اپنے بچے کو عمر بھر دودھ پلاتی
ہے۔ ہرنی کے اس گیت میں دکھ بھری انسانیت کی پکار تھی۔ مجبور اور بے بس انسان کے دکھوں کی ہتیا
تھی۔ آج کا انسان اس زخمی ہرنی سے کتنا ملتا جلتا ہے وہ بھی گھائل ہے اور ان دیکھے شکاری کے
تیر کو سینے میں لیے جنگل کی خون آلود زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ اسے ایک ایک کر کے اپنے سارے بچے
سارے چہرے، سارے سکھ، ساری خوشیاں یاد آ رہی ہیں۔ وہ شکاری کے ظلم کا شکار ہے مگر پھر بھی
اے بھائی تیر انداز کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ کیا زخمی ہرنی کی پکار کبھی نہ سنی جائے گی؟ سچترا کے دل پر اس
گیت کا بڑا اثر ہوا تھا۔ مگر وہ خاموش رہا۔

"اور کافی سچترا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں ـــ تمہیں گیت پسند آیا؟"

"بہت ـــ یہ جنگل کی ہرنی کی پکار تھی۔ میں تمہیں خانہ بدوش دریائی مانجھی کا ایک گیت سناتا ہوں۔ یہ گیت میں نے ڈھاکہ سے سلہٹ جاتے ہوئے نرائن گنج میں دریائے میگھنا کی لہروں پر ایک مانجھی سے سنا تھا۔ مجھے بنگالی گیت یاد نہیں رہا۔ ہاں اس کا ترجمہ ضرور یاد ہے۔" چنار نے سگریٹ بنا کر سلگایا۔ ایک ہلکا سا کش لے کر آنکھیں بند کیں۔ اس کی پلکیں سلگ رہی تھیں۔ آنکھیں کھول کر اس نے سچترا کو دیکھا جو اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھائے بڑے غمگین انداز میں اسے تک رہی تھی اور ہمہ تن گوش تھی۔ چنار نے گیت کا ترجمہ سنانا شروع کیا۔

ـــ الوداع! میرے دوستو! الوداع!

میرا گھر دریائے پدما میں ہے۔

ہم جانوروں کو پکڑنے والے لوگ ہیں

ہم ان جانوروں کو بیچ کر اپنی روزی کماتے ہیں

ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں ہے

ہم ان قیمتی پتھروں کا بھی کاروبار کرتے ہیں

جو ہم جان کی بازی لگا کر

زہریلے سانپوں کے بلوں سے نکال باہر لاتے ہیں

ہم دریا کے ایک کنارے پر موٹے چاول پکاتے ہیں

اور دریا کے دوسرے کنارے پر جا کر انھیں کھاتے ہیں

ہمارا کوئی گھر نہیں

ساری دنیا ہمارا گھر ہے

دنیا کے سارے لوگ ہمارے بھائی ہیں

ہم اپنے دوستوں کی تلاش میں

ایک دوست سے دوسرے دوست کے گھر تک چلے جاتے ہیں ـ"

اچانک ہوٹل کے ہال میں ڈسکو پر میوزک کا کارخانہ چلنا شروع ہو گیا اور فضا میں گھائل ہرنی

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

کی پکار اور نرائن گنج کے خانہ بدوش کا پُراثر آزاد گیت گم ہو کر رہ گئے۔ اب ان دونوں کے لیے بیٹھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ اٹھے اور ہوٹل مرینو کے بڑے آئینہ دار دروازے سے نکل کر باہر مال روڈ پر آ گئے۔ باہر سچترا کے پتاجی کے گاف روڈ والے رشتہ دار کی چھوٹی سی کالی کار کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔

"کیا میرے ساتھ گھر تک نہ چلو گے؟"

"میں تمہارے ساتھ بنگال تک جانا چاہتا ہوں سچترا ـــ"

"تو پھر کبھی ملنے وہاں آ جاؤ ناں۔"

"اگر زندگی نے وفا کی تو دیو داس اپنی پاربتی سے ملنے ایک بار بھدوان ضرور آئے گا۔ اچھا نمسکار!"

"نمسکار۔"

سچترا ہاتھ جوڑے کھڑی ہی رہ گئی اور چنار اس سے جدا ہو گیا شاید ہمیشہ کے لیے۔ سچترا ذرا سا ہنس پڑی۔ اس مسکراہٹ نے اس کے دل آویز چہرے کی اداسی کو زیادہ گہرا سنگین اور دردانگیز بنا دیا۔ وہ ساڑھی سنبھالتی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار رات کی روشنیوں اور اندھیروں میں مال پر سے ہوتی ہوئی گاف روڈ کی جانب بھاگنے لگی۔

چنار کا دل آج شام بڑا اداس تھا۔ وہ گھر جانے کی بجائے اس کلب کی جانب چل دیا جہاں اسے یقین تھا کہ نجمی اپنے ڈیڈی یا ممی کے ساتھ ضرور بیٹھی ہو گی۔ وہ کلب کے ہال میں آ گیا مگر یہاں اور تو سبھی لوگ تھے صرف نجمی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

"ہائی چیری!"

جمی کولا نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"یار چیری! آج تو کوئی بھی بے بی دکھائی نہیں دے رہی۔ سب بوڑھی گھوڑیاں بیٹھی ہیں۔"

اتنے میں دروازے کے باہر ایک کار آ کر رکی۔ جمی کولا فوراً اس طرف لپکا۔ چنار نے نجمی کی گاڑی پہچان لی۔ وہ ذرا پرے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کار کا دروازہ کھلا اور اندر سے نجمی اپنی ممی کے ساتھ باہر نکلی۔ جمی کولا نے بڑے مخصوص سفارتی عہدیداروں والے انداز میں ان دونوں کا خیر مقدم کیا اور نجمی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باتیں کرتا اس کے ساتھ کلب کے ہال کی طرف آگیا۔ یہاں چنار کھڑا تھا۔ نجمی اُسے دیکھ کر ذرا ٹھٹکی مگر فوراً ہی مسکرائی اور "ہائی چیری" کہہ کر چنار کی خیریت پوچھی۔ چنار خاموش رہا۔ نجمی کولا نے چنار کو بھی اپنے ساتھ کافی کی ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی مگر وہ شکریہ ادا کر کے کلب کے بار روم میں آگیا وہاں سے نکل کر تانگے میں بیٹھا اور سیدھا گھر آگیا۔

گھر میں ڈاکٹر ہومیو نے خاص طور پر بھینس کے پائے پکوا رکھے تھے اور پلنگ پر آلتی پالتی مارے سامنے ایک بڑا سا پایہ رکھے وہ اُسے مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ زلفی باورچی خانے میں زلف ماتے ہوئے ڈالے روٹیاں پکا رہی تھی۔ نویں جماعت والی تنک مزاج اختر دوسری انگیٹھی پر چائے کے لیے پانی کو جوش دے رہی تھی۔ چنار نے ان لوگوں کو ہمیشہ ناپسند کیا تھا۔ آج تو اُسے یہ لوگ زہر لگ رہے تھے زلفی کے ماتھے کی لٹ اُسے یوں لگی جیسے اس نے کالا بچھو اڑس رکھا ہو۔ اختر کی تنک مزاجی اُسے عورت کی طوائف کا نخرا معلوم ہوئی اور ڈاکٹر ہومیو ایسے لگا جیسے کسی مردہ سانڈ کی ٹانگ چبا رہا ہو۔ اس نے نفرت کی ایک جلتی ہوئی بھرپور نگاہ ان لوگوں پر ڈالی اور کچھ کھائے پیئے بغیر اپنے کمرے میں آگیا۔ کوئی بارہ بجے کے بعد دروازہ آہستہ سے کھلا اور زلفی پلیٹ میں چاول اور بھینس کی زبان رکھے اندر داخل ہوئی۔

"آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں ـــــ آخر کیا ناراضگی ہو گئی؟"

"اس تھالی میں کیا لائی ہو؟"

"بھینس کی زبان۔"

"لاؤ ـــــ میں زبان کھاتا ہوں تم اتنی دیر میرے کان کھاؤ۔"

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات بھی تو ہو۔"

"زلفی تم نے کبھی رسدوان کا نام سنا ہے؟"

"یہ کون آدمی تھا؟"

[illegible] ایک کچی سڑک کھیتوں کھیت گذرتی کسی زمیندار کی پرانی حویلی کو جاتی ہے۔ یہاں دونوں جانب چھالیہ اور ناریل کے پیڑ

خلیج بنگال کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں جھوما کرتے ہیں۔ مدت ہوئی اس کچے راستے سے ایک بیل گاڑی گذر رہی تھی۔ اس بیل گاڑی میں ایک قریب المرگ نوجوان بیٹھا تھا جو اپنی محبوبہ کے آخری درشنوں کو اس کے گھر جا رہا تھا۔ اس نوجوان کا نام دیو داس تھا۔"

زلفی کے چہرے پر چمک آگئی۔

"دیو داس؟ ـــــ ہاں ہاں اس کی تو فلم بھی لگی تھی۔ وہ گانا اسی فلم کا تھا۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں ؎

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا
سوئے ہوئے مُردے کو جگایا۔"

چنار نے اپنا سر پکڑ لیا۔

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تین دن بعد سچترا واپس کلکتے چلی گئی۔

چنار اس کے بعد اُسے بالکل نہیں ملا اور نہ اُسے سٹیشن تک چھوڑنے گیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کی روانگی کے بعد چنار کا دل غمگین ہو گیا اور لاہور کی سڑکوں، ہوٹلوں، دوستوں اور گلی کوچوں سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ پہلی تاریخ کو جب اُسے دفتر سے تنخواہ ملی تو اس نے اپنی بہن کی شادی کا بہانہ بنا کر ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی لی اور کراچی سے بحری جہاز میں سوار ہو کر ایک روز چٹاگانگ کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ جیٹی پر اچھی خاصی رونق تھی۔ رنگون سے ایک جہاز ابھی ابھی آکر دوسری گودی پر لنگر انداز ہوا تھا۔ اس جہاز کا نام PYIDAWN YUNT تھا۔ یہ جہاز رنگون سے چل کر یہاں چار دن میں پہنچا تھا۔ چنار نے کراچی سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے ایک دوست کو تار دے دیا تھا جو اسے لینے کے لیے بندرگاہ پر موجود تھا۔ اس دوست کا نام مرزا حیدر بیگ تھا۔ یہ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوا تھا اور ایک زمانے سے چٹاگانگ میں کاغذ کا بیوپار کر رہا تھا۔ اُسی شام وہ چنار کو اپنے ایک دوست کے ہاں دعوت پر لے گیا۔ یہ کوٹھی ایک چھوٹے سے ٹیرس پر واقع تھی جہاں پہنچنے کے لیے ایک اوپر چڑھتی ہوئی گول سڑک کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ رات بڑی خوبصورت تھی۔ چٹاگانگ کی خوبصورت عمارتیں ادھر اُدھر ٹیلوں اور درختوں کے جھنڈوں میں بکھری جگمگا رہی تھیں۔ فروری کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈی اور نم ہوا چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے فضا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔

کوٹھی کی لمبی سی لسٹ کاہ میں چٹاگانگ کی بچی ہوئی خوبصورت، خوش لباس اور کند ذہن

مخلوق بیٹھی تھی۔ ہر عورت نے بہترین ساڑھی اور جی بھر کر سونا پہن رکھا تھا۔ ایک لڑکی انتہائی حسین تھی۔ بالکل گریس کیلے کی شکل۔ چہرے پر ایک من موہنی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آنکھیں براؤن تھیں اور اسی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ چنار کو وہ اس لیے بھی پیاری لگی کہ وہ کسی بات میں خواہ مخواہ دخل نہیں دے رہی تھی۔ دوسری عورتوں کی طرح بڑھ چڑھ کر پھکیے لطیفے نہیں سنا رہی تھی۔ جس پر مہمان محض جی رکھنے کے لیے جی بھر کر ہنس رہے تھے۔ ایک عورت نے جس کا بے بی نوکرانی باہر لان میں لیے بیٹھی تھی، ہارمونیم پر ظفر کی غزل سنائی۔ سرکاری افسر لوگ جمائیاں لینے لگے۔ دوسری عورت نے لتا منگیشکر کا گایا ہوا ایک فلمی گیت سنایا۔ ایک نوجوان افسر نے کسی پھیٹچر شاعر کی بڑے ہی بھونڈے انداز میں شعر سنانے کی نقل اتاری اور رات کے ۲ بجے یہ انتہائی بور محفل ختم ہو گئی۔ جس کا سوائے چنار کے ہر آدمی نے پیٹ بھر کر لطف اٹھایا۔

دوسری شام کو چنار اکیلا ہی چٹاگانگ کے بازاروں میں گھومتا پھرا۔ کھلے کھلے کشادہ بازار بجلی کی روشنیوں میں بقعہ نور بنے ہوئے تھے۔ لوگوں کے چہروں پہ قدرے رونق تھی اور دکاندار ہنس ہنس کر گاہکوں سے بات کر رہے تھے۔ چنار نے ایک کتابوں کی دکان میں داخل ہو کر تصویروں والے کچھ انگریزی رسالے دیکھنے شروع کر دیئے۔ پھر وہ یہاں سے نکل کر پرانا سامان فروخت کرنے والے ایک کباڑیے کی دکان میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر تک مختلف چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ہر چیز کی قیمت پوچھی اور بغیر کچھ لیے دکاندار کی غضب ناک نگاہوں کا لطف اٹھاتا آگے چل پڑا۔ ایک جگہ اچانک اُسے بنگالی گانے کی آواز سنائی دی۔ وہ رُک گیا۔ قریب ہی گراموفون ریکارڈوں کی دکان تھی جہاں کسی عورت کا بنگالی ریکارڈ بج رہا تھا۔ چنار اس دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اور بڑے سکون سے کاؤنٹر کے ساتھ لگ کر گیت سنتا رہا۔

گیت کی لے اس قدر اثر انگیز اور طرز اس قدر پُراثر تھی کہ چنار مسحور سا ہو کر رہ گیا۔ جب گیت ختم ہو گیا تو اس نے دکاندار سے جو نوجوان بنگالی تھا گانے والی کا نام پوچھا۔

"آرپلا سین"

"اس گیت کا مطلب کیا تھا؟"

بنگالی دکاندار نے ذرا مسکراتے اور ذرا شرماتے ہوئے گیت کا ترجمہ کیا۔

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اوپر سے آنے والی ہوائیں جھوم رہے تھے۔ چنار ایک جگہ پان کھانے کے لیے رک گیا۔ پان بیچنے والا نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ چنار نے پوچھا۔

"کیوں یار! تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی محمود عالم"

"اچھا یار پان کھلاؤ۔"

"کیسی پان، بنگلہ پان یا بابو؟"

"بنگلہ پان دو دست! ۔۔۔ محمود یار تمہارا شہر بڑا پیارا ہے۔ کیا تم پڑھتے ہو؟"

"جی ہاں ۔۔۔ تھوڑا تھوڑا ۔۔۔"

اتنے میں ایک خوبصورت لڑکی قریب سے گذری۔ اس کے ماتھے پر ٹیکہ تھا۔ جوڑے میں چمپا کلی کے سفید پھول تھے۔ آنکھوں میں مست زور آشنگوں کا سرگمیں نمار تھا۔ چنار اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پان والے سے آنکھ مار کر بولا۔

"تھوڑی تھوڑی محبت بھی کیا کرو محمود عالم۔"

رات کو چنار کے دوست مرزا بیگ نے اپنی بوٹ پر دوستوں کو پارٹی دی۔ خوش اندام نازک بنگالی لڑکیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھیں۔ آسمان پر شام ہی سے بادل چھا آئے تھے اور بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی باقی سب مہمان بوٹ کے لاؤنج میں بیٹھے کافی پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے کاروبار کی سرکاری ترقیوں کی، ممکنوں کی تجدید نو کی، پٹ سن گانگ کے بدلتے ہوئے موسم کی باتیں کر رہے تھے۔ چنار اور مرزا نے ایک کیبن میں جا کر مشروب سے جی بہلایا۔ آنکھوں میں ٹمٹماتا ہوا گہرا خمار لیے باہر ڈیک پر آ کر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ دریا کے گدلے پانی میں بوٹ کی روشنیوں کا عکس پڑ رہا تھا اور بندرگاہ کی طرف روشنیوں کی جھلملاتی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ تیز ہوا میں چنار اپنے تئیں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

مرزا نے ڈیک پر چنار کا تعارف اپنی ایک گرل فرینڈ سے کروایا۔ کسم ۔۔۔ یہ اس بنگالی لڑکی کا نام تھا۔ دگ گندمی تھا جو شام کے بعد خمار کو سنہری دکھائی دے رہا تھا۔ سفید ململ کی ساڑھی پر سیاہ بھنوروں کی پنکھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ تیکھے ناک کے سرے سے ایک عجیب و ویران سی لکیر ہونٹوں

ہے تو کہو تم کتنی دیر اور پرانی میں رہو گے؟
کیا تمہیں رات کو نیند آ جاتی ہے؟
کیا تمہیں سوکھے پڑے ہیں۔
کالے بادل دھوسلا دھار برسا دو
سفید بادل آتے ہیں
اور سفید ہی اڑ جاتے ہیں۔
تم کب تک پٹ سن کے کھیت
چرواہے کی امروں پر گھومتے رہو گے؟
کیا تمہیں رات کو نیند آ جاتی ہے؟

بنگالی دکاندار نے ریکارڈ نکالنے میں ڈھائی گھنٹے لگا دیے۔ اس کا خیال تھا کہ گاہک کو یہ گانا اتنا پسند آیا ہے تو وہ اسے ضرور خرید کر رہے گا۔ اسے کیا خبر تھی کہ عام طور پر اچھے گانوں کے ریکارڈ دوسری بار خریدے جاتے ہیں۔ چنانچہ چنار کان لپیٹ کر باہر نکل آیا اور دوکاندار اپنا سا منہ لے کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

یہ پٹ سن کا نگ کا واحد بازار تھا۔ کتنے خوبصورت بازار کا کتنا غیر رومانوی نام رکھ چھوڑا ان لوگوں نے ۔۔۔ چنار کو عجیب و غریب قسم کا ذہنی تجربہ ہو رہا تھا۔ کبھی کسی مکان کی طرف سے کسی بہت ہی پرانے گیت کی صدا آ جاتی اور کبھی کسی لڑکی کے قریب سے گذرتے ہوئے اسے چنار کی تیز خوشبو محسوس ہوتی۔ اسے ان پرانے اور تاریخ کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے جنگلوں کا خیال آ رہا تھا جہاں کالی آنکھوں والی دیوداسیاں بالوں میں تتاری کے پھول سجائے، جسموں پر چمپا کی چھالیں لگائے انسانی محبت، وحشت اور بربریت کے گیت گایا کرتی ہیں۔ جہاں زرد آنکھوں والے خونخوار چیتے دن دہاڑے انسانی خون کی بو پا کر انھیں اٹھائے جاتے ہیں اور جہاں گہری کائی زدہ جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھول ان پرانی کبوتروں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو جھیل پر پھڑپھڑاتے

UrduPhoto.com

ہوئے جاتی ہوئی ڈھلانوں کے لمبے اونچے درخت کھڑے دریائے کرنافلی

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے کنارے تک چلی گئی تھی۔ سیاہ لمبے بالوں کی ایک لٹ ہوا کی اس کے آنچل سے ہوتے ہوئے سینے پر پڑی تھی۔ جب وہ مسکرائی تو اس کے خوبصورت دانت چمک اٹھے۔ چنار کی آنکھیں شدت سرور سے بوجھل سی ہونے لگیں۔

اے دل! اب عمر بھر یہیں بسر ہو — کیا جانے پھر کب اس لڑکی سے ملاقات ہو؟ پھر کب یہ موقع ایسی خوب ہو؟ وقت کی گھڑی میں سے یہ ایک ان مول لمحہ کا موتی اچھل کر تمہارے دامن میں آن گرا ہے۔ اسے اپنے سینے سے لگا کر اسی دریا میں چھلانگ لگا دے اور پھر کبھی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھ!

مرزا ان دونوں کو ڈیک پر اکیلا چھوڑ کر اندر بھائیوں کی خبر گیری کو چلا گیا۔ چنار اس لڑکی کے قریب آ گیا۔ وہ دونوں دریا کی طرف منہ کر کے جنگلے پر جھک کر کھڑے ہو گئے۔ تیز ہوا میں گلم کے سیاہ بال اس کے ماتھے پر اڑ رہے تھے۔

"گلم! کیا تم سے پھر کبھی ملاقات ہو گی؟"

گلم نے دریا کے دوسرے کنارے پر ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں پر نظریں جما کر کہا۔

"شاید — کبھی نہیں۔"

"کیوں؟"

چنار نے سرگوشی میں کہا۔ اسے اپنی آواز پر کسی دوسرے کی آواز کا شبہ ہوا۔ دریا کی تیز ہوا اسے اپنے ہی کہے ہوئے لفظوں کی گونج میں کرتی سنائی دی۔

"کیوں گلم؟ کیا یہ جادو کی رات ہماری آخری رات ہے؟ کیا تم رات کی رات ہی خواب کی کشتی پر مل کر ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاؤ گی۔؟"

گلم کچھ نہ بولی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے سے تھے۔ آنکھوں میں گہری محویت کی پراسرار چمک تھی اور مہکتا ہوا جسم چمپا کلی کی دلربائی خوشبو اڑا رہا تھا۔ ایک مچھیرا اپنی چھوٹی سی کشتی کو کھیتا ہوا بوٹ کے پیچھے سے گذرا۔ پانی میں چپک چپک کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے

UrduPhoto.com

جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں گلم — میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

UrduPhoto.com

"یہ کہہ رہا تھا — دریا کی لہرو! میں تمہارے سینے پر ہزارہا سالوں سے کشتی کھے رہا ہوں۔ لیکن میرے سینے کی آگ تمہارا دریا بھی سرد نہیں کر سکا۔ ہمارا ساتھ کبھی نہیں چھوٹے گا۔ ہم کبھی سمندر کی موجوں سے ہم کنار ہوں گے —"

چنار نے گلم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ گلم کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ دریا کی لہروں کی مانند آسی ماہی گیر کے دل کی مانند —!

اگلے روز چنار گاڑی میں بیٹھا ٹنگ سے ڈھاکہ کی طرف جا رہا تھا۔

ہرے بھرے بانس کے سرسبز جھنڈ، چھالیہ کے درختوں کے ذخیرے، کیلے کے درختوں کی قطاریں اور دھان کے گہرے سبز لہلہاتے کھیت گذرتے چلے جا رہے تھے۔ وقت کی ہر خوبصورت یاد پیچھے کی سمت، ماضی کی طرف، اندھیرے کی طرف بھاگی جا رہی تھی اور گاڑی آگے ہی آگے اڑی جا رہی تھی، سورج کی طرف، روشنیوں کی طرف مستقبل کی طرف، ڈھاکہ کی طرف! آم اور کیلے کے گھنے باغوں کے بیچوں بیچ جانے والی پگڈنڈیوں پر سفید سبز اور سرخ دھوتیوں والی عورتیں کانسی کی گاگریں اٹھائے تالابوں کی جانب پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ ننگ دھڑنگ مٹی میں لتھڑے کالے معصوم بنگالی بچے گاڑی کا تماشا کرنے کھیتوں میں بھاگتے ہوئے آتے اور پھر دور کھڑے ہو کر ہاتھ ہلانا شروع کر دیتے۔ پان کے چاروں طرف سے ڈھکے ہوئے کھیتوں میں مزدور کام کر رہے تھے۔ گاڑی دریا کے پل پر سے گذرتی تو پانی کی پرسکون نیلی سطح پر کشتیوں کی قطاریں رواں دواں دکھائی دیتیں۔ بانس کی کھپریل والی ڈھلوان چھتوں والے مکانوں کے اوپر کیلے کے چوڑے چوڑے پتوں والے درخت ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ جھونپڑیوں کی ڈھلوانی چھتوں کے کنارے نیچے کو آ کر اندر کو مڑ گئے تھے۔

پھول باڑی، فینسی، فرید پور، کومیلا — پرانے مکانوں کی بارش زدہ کالی کالی دیواریں — چھوٹے چھوٹے تنگ دروازے، لمبوتری کھڑکیاں، زمردیں، قرمزی، کاسنی اور کتھئی دھوتیوں والی کسان عورتیں، نیم عریاں جفاکش بنگالی کھیت مزدور، کھیتوں سے بلند ہو کر غریب بستیوں کی جھونپڑیوں میں گم ہوتی ہوئی پگڈنڈیاں، جھونپڑوں کی چھتوں پر چڑھی ہوئی کدو کی سفید پھولوں والی بیلیں، گندے اور کائی لگے تالابوں میں اترتی ہوئی پتھریلی سیڑھیاں جن کی دراڑوں میں گھاس اگ آئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فینی سے گاڑی چل کر ذرا باہر نکلی تو لائن کنارے والی آبادی میں ایک بچی نے آنگن سے پیڑ کی ٹہنی جھکا کر بسنتی پھول توڑے اور اچھلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اندر یقیناً ایک ویران خانہ ہوگا شریفانہ نشست گاہ — ایک تخت ہوگا جس پر چادر بچھی ہوگی بچی بسنتی پھول گدان میں لگا دے گی رسوئی سے کسی عورت کی آواز آئے گی۔

"آئی دیدی"

اور وہ بچی اتنا کہہ کر دوسری طرف نکل جائے گی اور وہ کمرہ ویران رہ جائے گا۔ لیکن اس کی ویرانی میں بھی ایک بھرپور آبادی ہوگی۔ ایک سرخ تلک والی لڑکی اپنے مکان کی کھڑکی کا آدھا پٹ کھولے گذرتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔ چنار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ لڑکی نہ شرمائی اور نہ پیچھے ہٹی۔ بڑی حیرانی سے اسے دیکھتی چلی گئی۔ مگر بانس کے پٹ والی کھڑکی گاڑی کے ساتھ ساتھ نہیں آسکتی۔ شاید اس لڑکی کی نگاہیں ڈھاکہ تک گاڑی کے ساتھ ساتھ آئی ہوں۔ چنار نے سگریٹ بنا کر سلگایا۔

اب اس لڑکی کو پھر کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ اب دوبارا درشن نہیں ہوں گے۔ اس اتھاہ بھیڑ میں ایک خوبصورت چہرہ پل بھر کے لیے ابھر کر ڈوب جاتا ہے اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ شاید سالہا سال بعد کبھی بڑھاپے میں زندگی کے کسی دوراہے پر ملاقات ہو جائے۔ لیکن پھر ایک دوسرے کو کوئی بھی پہچان نہ سکے گا۔ نظر کمزور ہو چکی ہوگی۔ یادیں محو ہو چکی ہوں گی۔ جوانی کا پہچان بڑھاپے کے ٹھنڈے بے حس سکون میں تبدیل ہو گیا ہوگا۔ پھر کسی کو یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ قریب آکر کھوئی ہوئی محبت کی سرگوشی میں کہے:

"میں نے تمہیں کھڑکی میں سے ایکبار دیکھا تھا میں نے آج تک وہ کھڑکی بند نہیں کی"

چنار ہنس پڑا — بھلا کون کسی کے لیے گھر کی کھڑکی عمر بھر کھلی رکھتا ہے۔ یہ رومانی خیالات بھی عجیب چیز ہیں۔ شام کو وہ ڈھاکہ پہنچ گیا۔ ڈھاکہ میں مرزا بیگ کے ایک دوست کے نام اس کا خط چنار کے پاس موجود تھا۔ مرزا کا وہ دوست چنار کو لینے وہاں موجود تھا۔ یہ شخص بھی جوان ہی تھا اور آنکھوں کے گہرے حلقے اس کی شب بیداریوں اور میخواریوں کا بھانڈا پھوڑ رہے تھے۔

UrduPhoto.com

چنار اپنے ڈھاکہ والے نئے میزبان کے ساتھ شاہ باغ ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے اور کبھی کبھی کافی کے ایک دو گھونٹ بھی لے لیتے تھے۔ اس نئے میزبان کا نام صالح تھا۔ صالح مشرقی پاکستان کا باشندہ تھا اور یہیں اپنے باپ کے ساتھ پٹ سن کا کاروبار کرتا تھا۔ صالح کہنے کو تو کاروباری تھا لیکن طبیعت بڑی رنگین پائی تھی۔ بنگالی لٹریچر سے بھی اسے بڑا لگاؤ تھا۔ قاضی نذرالاسلام، ٹیگور، سرت چندر، جسیم الدین، بارہویں صدی عیسوی کے شاعر جے دیو اور نیچر کے پرستار گم نام دیہاتی شاعر کیتبا د کے لافانی ٹکڑے اسے زبانی یاد تھے۔

"کیتبا د کی جنم بھومی اگلا تھی۔ اسی گاؤں کے ڈاک خانے میں ملازم تھا اسی برس کی عمر میں وفات پائی اور اس دوران میں شاید ہی کبھی شہر کا منہ دیکھا۔ وہ ردی کاغذوں کی پشت پر نظمیں لکھا کرتا جسے اس کی بیوی بعد میں کاپی پر نقل کر لیا کرتی۔ دفتر سے فارغ ہو کر اپنی بچی کے ساتھ دھان کے کھیتوں میں پھرا کرتا۔ کسانوں اور ماہی گیروں سے اس کا بڑا یارانہ تھا کیا تمہارے ہاں کے شاعر بھی ایسا کرتے ہیں؟"

چنار نے کافی کا گھونٹ بڑی مشکل سے نگل کر کہا۔

"اول تو ہمارے ہاں کے شاعر بہت کم کوئی کام کرتے ہیں۔ اگر کام کرتے ہیں تو شعر نہیں کہتے۔ اگر شعر کہتے ہیں تو صرف دوستوں کو سنانے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ ہوٹلوں میں بیٹھ کر کسانوں کے متعلق سوچتے ہیں اور کسانوں میں پہنچ کر انھیں ہوٹلوں کی یاد ستاتی ہے۔ وہ صرف عشقیہ غزلیں لکھتے ہیں اور مصیبت یہ ہے

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ انھیں مشق کرنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔"

ان کی میز کی دائیں جانب دیوار والے قمقموں کے نیچے ایک میز پر کچھ لوگ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک موٹا سا مجذا امریکی تھا۔ ایک چوڑے ماتھے، باریک ہونٹوں اور تیکھی آنکھوں والی دبلی پتلی سانولی سی پرتگیزی لڑکی تھی اور میرا معمولی چہرے مہرے کا ایک عام نوجوان جس کے گھنگھریالے بال خوب چمک رہے تھے۔ لڑکی سگریٹ پھونک رہی تھی اور ساتھ ساتھ کافی کی چسکی بھی لگا لیتی تھی۔ ریچھ نما بدوضع امریکی بہک گیا تھا اور اب لڑکی کی طرف جھک جھک کر کچھ کہہ رہا تھا۔ دوسرا شخص خالی خالی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ موٹا امریکی نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے ہر بار لڑکی کو بھی پیش کرتا۔ وہ مجھ سے اپنا اور اس کا سگریٹ سلگا دیتی۔ اس کے سگریٹ پینے کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ تمباکو نوشی کی عادت نہیں ہے لیکن کسی خاص مجبوری کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے۔ مشروب بھی اس کے لیے اجنبی ہی تھا۔ صالح نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"اس طرف دیکھنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔ یہ عورت اس گھنگھریالے بالوں والے نوجوان کی بیوی ہے۔ اگر تم چاہو تو کل یہ تمھارے پہلو میں بھی بیٹھ سکتی ہے۔ ان کا تو وطیرہ ہی یہی ہے۔ خاوند کو منشیات کی لت پڑ گئی ہے اور اپنی اس عادت کو پورا کرنے کے لیے اس نے بیوی کو بھی ایک عادت ڈال دی ہیں۔"

اتنے میں بیرا بل لے آیا۔ خاوند نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ بیوی نے مسکراتا ہوا چہرہ موڑ کر امریکی کی طرف کر لیا۔ امریکی نے آہستہ سے اس کے گالوں کو تھپتھپایا اور بل پے کر دیا۔ چار اکٹھے ہوا۔

"چلو چلیں ـــــ یہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتا۔"

رات بہت بیت چکی تھی۔ آسمان مشرق بعید کے چمکیلے ستاروں سے اٹا پڑا تھا۔ وہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے ڈھاکہ کے خوبصورت اور خاموش علاقے رمنا کی طرف نکل گئے۔ ہلکے ہلکے خمار میں گنجان درختوں کے جھنڈوں کی طرف سے آتی ہوا کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈی سی لگ رہی تھی۔ ادھر ادھر باغوں کے بیچ میں بنی ہوئی اپنی وضع کی کوٹھیوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ صالح نے سگریٹ

سلگا کر دیا سلائی پھینکتے ہوئے کہا۔

"تم نے ابھی مشرقی بنگال نہیں دیکھا۔ یہ شہر بنگال نہیں ہے۔ یہ شہر ہے۔ جہاں مشرقی بعید کے دوسرے شہروں کی طرح سوائے غربت، افلاس، گندگی اور شور کے اور کچھ نہیں۔ ہاں کہیں کہیں رمنا قسم کی آبادیوں کے جزیرے ضرور مل جاتے ہیں۔ اصل بنگال یہاں سے گذر جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ غربت اور افلاس تمھیں وہاں بھی ملے گا۔ لیکن یہ کہاں نہیں ہے؟ یہ تو اب دنیا کا مقسوم ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے اپنے انداز میں ہر جگہ میں یہ دونوں چیزیں ہمیں مل جائیں گی۔ میں یورپ کا چپہ چپہ گھوم آیا ہوں۔ میں نے وہاں بھی لوگوں کو روٹی یا شراب کے لیے چوری کرتے دیکھا ہے۔ یہاں کے لوگ موٹے چاول جاہی دال کھا کر کھیتوں میں جفاکشی سے کام کرتے ہیں۔ ماہی گیر منہ اندھیرے جال لے کر اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی لہروں پر نکل جاتے ہیں اور رات گئے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ ان کی کمائی کا اسّی فیصد دلّال اور ایجنٹ لے جاتے ہیں۔ اپنی محنت دوسروں کو سونپ کر یہ پیدائشی محنت کش لوگ الاؤ جلا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کوئی بانسری پر بھٹیالی چھیڑتا ہے اور ایک تڑپتا ہوا رُخمی نغمہ فریاد بن کر کسی نہ کسی کے لبوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ ان کے ہر گیت میں ان کے اپنے دکھوں اور مصیبتوں کی بپتا ہوتی ہے جو بات یہ دوسروں کے منہ پر نہیں کہہ سکتے آسے یہ اپنے گیتوں میں بڑی صاف گوئی سے بیان کر جاتے ہیں۔"

"کیا تمھیں ان لوگوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے؟"

"ہم شہر والے لوگ ان لوگوں میں جا کر نہیں رہ سکتے۔ شہر کی اپنی تہذیب ہے۔ اپنی ضروریات ہیں، اپنی مجبوریاں ہیں۔ یہاں جو ہمیں زنجیریں پڑی ہیں وہ ہمیں یہاں سے ایک انچ نہیں ہلنے دیتیں۔ پھر بھی میں کبھی کبھی ان زنجیروں کو اپنے ساتھ ہی لے کر دریاؤں، میدانوں، اور کھیتوں کی آوارہ گردیوں کو نکل جایا کرتا ہوں۔ میں تمھیں ایک بڑا دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ یہ دلچسپ بھی ہے اور کچھ درد انگیز بھی ـــــ پھول باڑی سے آگے ایک گاؤں ہے۔ میں اپنی آوارہ گردیوں کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔ میں رات کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سٹیشن ماسٹر کے کوارٹر کی چھت پر سوتا اور دن کو گرد و نواح کے دیہاتوں میں کئی کئی میل کے چکر لگاتے نکل جایا کرتا۔ ایک دن روزنامچے کے مطابق میں چائے پی کر باہر جانے ہی لگا تھا کہ پار بتی پور کی جانب سے ایک گاڑی آ کر وہاں رکی۔ میں مسافروں کو اترتے چڑھتے دیکھنے کے لیے وہاں پل طبر کو ٹھہر گیا۔ ایک ڈبے میں سے کچھ بیراگی لوگ اترے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ ہمارے ہاں بیراگی کون لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آوارہ گرد یا خانہ بدوش گویے ہوتے ہیں۔ جوڑ ٹولیوں کی صورت میں دیہاتوں میں پھرا کرتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو شادی یا دوسرے خوشی کے موقعوں پر اپنے آپ ہی لوگوں کے گھروں میں جا کر اپنی محفل جما دیتے ہیں اور مجمع جو مل جائے لے کر آگے چل دیتے ہیں۔ عام طور پر ان لوگوں کے گیت بڑے دردانگیز اور پُرسوز ہوتے ہیں اور یہاں کے دیہاتی ان کے گیتوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔"

اب وہ دونوں رمنا کے علاقے سے نکل کر ڈھاکہ کی ایک پرانی سڑک پر سے گذر رہے تھے یہ سڑک بجلی قمقموں سے روشن تھی اور سیدھی شاہ باغ ہوٹل کی طرف نکل گئی تھی۔ صالح بڑے مزے لے لے کر اپنا روحانی حادثہ سنا رہا تھا اور چارمینار سگریٹ سلگائے بڑی دلچسپی سے اسے سن رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں بڑی گہری اور دل میں اتر جانے والی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں قدم قدم چل رہے تھے اور انہیں ان گاڑیوں کا مطلق احساس نہیں ہو رہا تھا جو پٹرول کی بو اور انجن کا ہلکا سا شور چھوڑتی قریب سے گذر جاتیں۔

"میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ پار بتی پور والی گاڑی میں سے کچھ بیراگی اترے جن میں سے کسی نے اک تارا اور کسی نے ڈھلی اٹھا رکھی تھی۔ ان بیراگیوں کے ساتھ ہی ایک بیراگن بھی گاڑی سے اتری۔ اس کے ہاتھ میں اک تارا تھا۔ اس نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور ماتھے پر تلک لگائے ہوئے تھے۔ وہ جوان تھی اور جسم کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ ماتھے پر تلک لگا تھا اور گلے میں سبز منکوں کی مالا پڑی تھی۔ اسی لمحے میں اور سارا گاؤں ہی زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کی

UrduPhoto.com

خوبصورتی دیکھ کر سارا سٹیشن تنگ رہ گیا۔ بیراگی اس کی طرف آنکھیں اٹھا نہ سکا۔ پھر آنکھیں نہ جھپک سکا۔ عورت کا حسن واقعی بہت بڑی مقیقت ہے۔ جس عورت کو دیوتا نہ بنا دیتی ہے۔ قسمت میں تو ہمیں سوائے میک اپ اور ٹھنڈی ہوئی لحموں کے اور کچھ نہیں ملتا۔

میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اس عورت یعنی بیراگن کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں بھی اس کی جانب نظریں اٹھا کر پھر اپنی پلکیں نہ جھپک سکا۔ وہ بیراگن ایک شعلہ تھی جس نے گاڑی سے باہر نکل کر سارے سٹیشن میں آگ لگا دی تھی۔ ہر شے جل رہی تھی، سلگ رہی تھی، روشن ہو گئی تھی۔ بیراگن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سٹیشن سے باہر نکل کر ایک گاؤں کی طرف چل دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بانس کے درختوں کے جھنڈوں میں غائب ہو گئی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں اس عورت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟ اس نے بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں ایک شادی ہے گانے بجانے جا رہے ہیں اور یہ محفل رات کو لگے گی۔ میں بھی رات کو اس گاؤں میں جا پہنچا۔ شادی والا گھر ڈھونڈنے میں مجھے کوئی بھی دقت نہ اٹھانی پڑی۔ جب میں اس گھر کے باہر پہنچا تو گانا شروع ہونے ہی والی تھی۔ بڑے سے پیپل کے درخت کے نیچے گیس روشن تھا۔ دریاں بچھی تھیں۔ لوگ بیٹھے آپس میں ہنس بول رہے تھے وہی بیراگن لوگوں میں پان تقسیم کر رہی تھی اور لوگ اسے مذاق کر رہے تھے جس کا جواب وہ صرف مسکرا کر دے رہی تھی۔ مجھے لوگوں کے مذاق اور بیراگن کی مسکراہٹ پر بڑا غصہ آیا۔ مگر میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ دوسرے بیراگی دری پر ٹولی بنا کر بیٹھے اکتارہ ٹن رہے تھے۔ پان تقسیم کرنے کے بعد بیراگن سامنے آ کر دری پر بیٹھ گئی۔ بیراگیوں نے اکتارہ چھیڑا، گھنگھرو ڈھلی اور بانسری کی ملی جلی خوش آہنگ صدائیں بلند ہوئیں اور بیراگن نے ہاتھ باندھ کر آنکھیں بند کر کے گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز بڑی ہی سریلی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سنہری دھوپ اور کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے مست ہو کر کوئی بلبل نغمہ سرا ہے۔ کچھ دیر وہ گاتی رہی۔ پھر اس کا ساتھ دوسرے بیراگی بھی

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینے لگے۔ اب یہ ہوتا کہ ایک مصرعہ بیراگی دہراتے اور دوسرا مصرعہ بیراگن گاتی۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھی اور اس نے بڑے ہی خواب انگیز انداز میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ اس رقص میں جسم کی تھرکن کم اور گیت کے درد انگیز لہجے کے نزاکت زیادہ تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ہیراگنوں کے منہ سے نکلے ہوئے بول ہیراگن کے وجود کی گہرائیوں سے رقص کر رہے ہیں اور رقص ان کے لبوں تک جا کر نغمے میں ڈھل رہا ہے۔ گیت کی دھن کے ساتھ ساتھ رقص کی گردشیں بھی تیز ہو گئیں۔ اب وہاں رقص اور نغمے کا طوفان امڈ آیا تھا۔ ایک بول ہیراگی کہتے اور دوسرا ہیراگن گاتی۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے ماتھے سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ کبھی وہ عجیب ادا سے کسی ان دیکھے پریتم کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی اور کبھی ایکدم یوں اداس ہو جاتی گویا پھر کبھی دیدار نصیب نہ ہوگا۔ رقص، نغمے اور گیت میں ڈھل گیا تھا۔ لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ گاتے گاتے ہیراگن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اب جو میں نے دیکھا تو محفل کے بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ گیت جو ہیراگن گا رہی تھی بڑا ہی دل ہلا دینے والا تھا۔ گیت تھا ــــ

ــــ مجھے بتاؤ میں کب تک آگ بجھاتی رہوں؟ کب تک اپنے سینے کے اندر انگارے دبائے رکھوں۔ میرے پریتم! جسے محبت کا سانپ ایک بار ڈس جاتا ہے پھر وہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ پھر اسے سوائے محبوب کے دل بھرے ہونٹوں کے دنیا کا کوئی منتر زندہ نہیں کر سکتا ــــ"

محفل ختم ہو گئی۔ میں نے رات اسی گاؤں میں بسر کی دوسرے روز صبح اندھیرے ہی گاؤں کے تالاب پر جا کر چھپ گیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ اسی طرف ضرور آئے گی۔ میں بانس کے درختوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ہیراگن نمودار ہوئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں ایک اور دوسری ساڑھی تھام رکھی تھی۔ تالاب کے کنارے پہنچ کر اس نے اپنی ساڑھی اتارنی شروع کر دی۔ جب وہ نہا کر نکلی تو اس کا جسم بالکل شفاف ہو گیا تھا۔ وہ سنگ مرمر کی مورتی

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

[illegible] تالاب کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی اور میں اپنے دل [illegible]
[illegible] جسم کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوسری ساڑھی [illegible] بالوں کو نچوڑ کر جھٹکا اور ایک پھول دی۔ پھر اس نے اپنی گل مہر کا ایک سرخ پھول لگا ہوا تھا۔ میں نے وہ پھول اتار لیا اور دوسری طرف سے ہو کر اس کے راستے میں آن کھڑا ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک سی گئی پھر مسکرائی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ یہ لوگ ہندو تھے اور گل مہر کا پھول پیش کیا۔

"تم حسن رتی اور سنگیت کی دیوی کے قدموں میں ہو"

اس نے مسکراتے ہوئے پھول لے کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔

"کیا دیوی کے پھر بھی درشن ہوں گے؟"

"ہم ہیراگی لوگ ہیں بابو۔ ہم کہیں بھی ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہرتے"

"میں ہر رات دیوی کے ساتھ سفر کروں گا۔"

"تو پھر ہیراگی بن جاؤ"

اب تم سے کیا چھپاؤں۔ مجھے ہیراگن سے محبت ضرور ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی خاطر میں اپنا پیشہ سن کا کاروبار، موروثی گاڑی، تیج گاؤں والی چھوٹی سی کوٹھی اور ہوٹل شاہ باغ کا لالچ نہیں چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ میرا مطلب صرف اتنا تھا کہ وہ کبھی کبھی جب میں دیہاتوں کی آوارہ گردی کو آؤں تو مجھے مل لیا کرے۔ یا اگر وہ راضی ہو جائے تو کچھ دنوں کے لیے شہر میرے ساتھ چلی چلے۔ ہم شہر والوں کی محبت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ بھائی ہم تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر محبت کر سکتے ہیں۔ عشق میں جنگلوں کی خاک ہم سے نہیں چھانی جاتی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں تم سے پریم کرتا ہوں دیوی۔ میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہیراگن میری اس بات پر قہقہہ لگا کر ہنس دی۔"

"ہم تو ہیراگی ہیں بابو۔ ہم نہ پریم کرتے ہیں نہ بیاہ۔ ہم تو صرف ہیراگ لیتے ہیں اور گاتے ہیں، رقص کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں خاموشی رہا۔ میں اُس کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ کیوں کہ میں اصلی خانہ بدوش نہیں تھا۔
میں نے تو
محض کچھ دیر کے
لیے خانہ بدوشی کو اپنا رکھا تھا۔ اُسی دن وہ ہیرا گن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوسرے گاؤں
کو چل دی۔ جب وہ گاؤں سے جا رہی تھی تو میں اُسی پرانے پیپل کے درخت تلے کھڑا
تھا۔ اُس نے میری طرف آخری بار مسکرا کر دیکھا اور آگے نکل گئی۔ اُس کے سیاہ بالوں میں
سُرخ گل مہر کا پھول اسی طرح لگا تھا میری ناتمام محبت کی آخری نشانی! میں اُس
نشانی کو دُور تک دیکھتا رہا جو اُس کے سیاہ بالوں میں آگ کا انگارا بنی دیکھ رہی
تھی۔ مجھے ہیرا گن کے گیت کا وہ بول یاد آگیا ــــ "مجھے بتاؤ میں کب تک اپنی چھاتیوں
میں انگارے دبائے رکھوں؟"

صالح اپنی داستانِ محبت سُنا کر خاموش ہو گیا اب شاہ باغ ہوٹل بالکل سامنے ہی تھا۔ وہ
دونوں خاموشی سے اس کے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کافی منگوا کر اس کی دو ایک چسکیاں لیں۔
دونوں ہیرا گن والے واقعے سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ صالح اُس کو سُنا کر اور چنار اُسے سُن کر۔
چنار نے پوچھا۔

"کیا پھر اُس ہیرا گن سے ملاقات ہوئی کبھی؟"

"نہیں ــــ ہیرا گیوں کے ٹھکانے کی بھلا کسی کو کیا خبر ہو سکتی ہے؟"

"تم نے کوشش بھی نہیں کی؟"

"میری آوارہ گردی کا وقت ختم ہو گیا تھا اور اب مجھے ڈھاکہ آ کر دفتر کا کام سنبھالنا
تھا۔"

"جب آدمی محبت پر پٹ سن کی گانٹھ کو ترجیح دے تو اُس کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

"لیکن بھائی پٹ سن کی گانٹھ نہ ہو تو ہم محبت بھی نہیں کر سکتے۔"

چنار خاموشی سے کافی کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو اب چلیں۔"

"تھوڑی دیر رُک جاؤ۔ شاید وہ گھنگھریالے بالوں والا اپنی بیوی کو لے کر پھر یہاں

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

آ جائے۔"

"بیوی نہ کہو صالح ــــ میں بیویوں کا احترام کرتا ہوں۔ اور میں کسی کی بیوی سے عشق
بازی کر بھی نہیں سکتا۔"

"لیکن وہ تو اس کا دلال ہے۔ بھائی تم کہاں کی بات کہاں جا ملا رہے ہو۔"

"کچھ بھی ہو تمھیں ایسی باتیں زبان پر نہیں لانی چاہئیں۔ میں حیران ہوں کہ ایک ہیرا گن سے
عشق کرنے والا ایک بے بس عورت کی جبری عشق بازیوں پر طعنہ زنی کر رہا ہے۔ محبت
کرنے والے تو بڑی عزت کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا تم
بھی سچے ہو۔ یہاں تمھاری پٹ سن کی گانٹھیں بول رہی ہیں ــــ چلو اب چلیں۔"

صالح قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور چنار کے ساتھ ہوٹل شاہ باغ سے باہر نکل آیا۔ گاڑی میں تیز
گاؤں کی طرف جاتے ہوئے صالح نے بتایا کہ وہ کل اُسے ایک اسکول ماسٹر کے گھر لے جائے گا جس کی
لڑکی بہت اچھا گاتی ہے۔

"کیا وہ بھی کسی کی بیوی ــــ؟"

"ارے نہیں بھائی۔ وہ تو بڑے شریف لوگ ہیں تم خود جا کر دیکھ لینا ــــ"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکول ماسٹر کا چھوٹا سا اک منزلہ مکان شہر سے باہر ایک پرانے تالاب کے بائیں کنارے واقع تھا۔ تالاب بڑا گندہ تھا جس کے کنارے کی دلدل میں ایک کشتی آدھی پھنسی ہوئی تھی۔ مکان کی دو کوٹھڑیاں تھیں کہ ایک برآمدہ آتا جس کے ساتھ ہی دو چھوٹے کمرے اور بیچ میں ایک کھلا کمرہ تھا۔ پرلی جانب رسوئی اور چھوٹا سا آنگن تھا جس کی دیوار کے ساتھ کیلے اور سیتا پھل کے پیڑ کھڑے تھے۔ صالح کے ماسٹر صاحب سے بڑے دیرینہ تعلقات تھے۔ ماسٹر صاحب نے عینک لگا رکھی تھی۔ ادھیڑ عمر کے مرنجاں مرنج سے گٹھیلے آدمی تھے۔ جھک کر ملے اور اندر لے گئے۔ فرش پر دری بچھی تھی اور دو تین آرام کرسیاں ایک کونے اور دیوار کے ساتھ پنگ لگا تھا جس کی پٹی پر کسی بچی کا میلا سا فراک پڑا تھا۔

رات کا کھانا انھوں نے ماسٹر صاحب کے ہاں کھایا۔ صالح اپنے ساتھ ہوٹل خیاباں سے ایک چرغہ اور پھلوں کی ٹوکری لیتا گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب لوگ آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے اور سگریٹ وغیرہ پینے لگے۔ ماسٹر صاحب کی خالص بنگالن بیوی نے فرنی اپنے ہاتھ سے بنائی تھی جس پر سیوے لگے ہوئے تھے۔ ماسٹر صاحب کی بڑی لڑکی اپنی موسی کے ہاں پڑھنے گئی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو آدھر روانہ کر دیا۔ چھوٹی لڑکی نے مہمانوں کے گلے میں رتن جوگے سفید پھولوں کے ہار پہنائے۔ یہ بچی پانچ سال کی ہوگی۔ بڑی پیاری اور معصوم تھی۔ سفید فراک میں بالکل گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب کی بڑی لڑکی بھی آ گئی اس کے ہمراہ خالہ کی لڑکی بھی تھی۔ دونوں لڑکیوں نے جھک کر سلام کیا اور اندر چلی گئیں۔

دونوں کی عمریں سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ دبلی پتلی اور نرم و نازک سی شرمیلی بنگالی

لڑکیاں تھیں جنھوں نے سفید ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں اور ماتھے پر ٹیکہ لگا رکھے تھے۔ ماسٹر صاحب نے بیوی کو بلا کر ان کے کان میں کچھ کہا اور خود اندر سے جا کر ہارمونیم اٹھا لائے۔ چند لمحوں کے بعد دونوں لڑکیاں بھی اندر آ گئیں اور ماسٹر صاحب کے پاس آ کر دری پر بیٹھ گئیں۔ ماسٹر صاحب نے بنگلہ زبان میں اپنی لڑکی سے کچھ کہا اور وہ شرماتی ہوئی اٹھ کر ذرا آگے ہو کر دری پر بیٹھ گئی۔ ماسٹر صاحب نے ایک سلی سی پاکٹ بک کھول کر ہارمونیم کے اوپر رکھ لی اور اس پر نظریں جمائے ہارمونیم کے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا۔ ان کی بڑی لڑکی نے بھی سر اٹھایا اور نظریں زمین پر گاڑے بڑی سریلی اور چکیلی آواز میں گانے لگی۔ اس دوران میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نظریں اٹھا کر اوپر نہ دیکھا۔ یہ بنگلہ گیت خدا کی عظمت کے بارے میں تھا۔ اور اس میں اس کی صفات کو بڑے مؤثر اور دلپذیر انداز میں گنوایا تھا۔

گیت کے بعد اس لڑکی نے مشرقی پاکستان کے ایک کسان کی روزمرہ زندگی کو بیلے کی صورت میں پیش کیا۔ وہ رقص کی دھیمی گردشوں اور تیکھے نرت سے گیت گاتے ہوئے اس کا مفہوم بھی ادا کر رہی تھی۔ کبھی وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بارش کی دعا مانگتی کبھی بازوؤں اور انگلیوں کی تیز حرکات سے برستی بارش کا سماں پیش کرتی۔ کبھی زمین پر جھک کر دھان کی پنیری بوتی، کبھی لہلہاتے کھیتوں کے مناظر دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگتی۔ پھر تالی کی تال پر دھان کی کٹائی میں لگ جاتی — پھر فصل کا انبار لگا کر اس کے اردگرد رقص کرنے لگی — پھر ایک دم سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ ساہوکار اور زمیندار اور لہردار اپنا اپنا حصہ لینے وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ کبھی اس بچے کو سنبھالتی کبھی اس بچے کو سنبھالتی کبھی اس بچے کو گود میں اٹھاتی — پھر ساری فصل ہاتھ سے نکل گئی۔ سارا پسینہ پانی بن کر مٹی میں بہہ گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیے۔ ایک بار پھر موسلا دھار بارش کے لیے جو اس کے کھیتوں اور جھونپڑوں کو بہا کر لے جائے۔

بیلے ختم ہوا تو خیار حیران سا ہو کر رہ گیا۔ ماسٹر صاحب کی دبلی پتلی کمزور سی لڑکی نے اس چابکدستی اور انتہائی فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ایک عام کسان کی جدوجہد بھری زندگی کا نقشہ پیش کیا تھا۔ کہ ہمارے کسی شاعر یا ادیب کو زندگی اور فن کا یہ معراج شاید ہی کبھی نصیب ہو سکے۔ دونوں رات گئے وہاں سے واپس ہوئے۔ رات بھر خیار ماسٹر صاحب کی لڑکی کے فن کی سادگی اور پھول باڑی والی ہیرا گن

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بارے میں وحشی گیت اور چڑھائی کی لہروں، ایسی آزاد اور بیکراں محبت کے بارے میں سوچتا رہا
اپنے ایک ہی ملک کے دوسرے حصے میں تھا۔ مگر لاہور کی زندگی سے اپنے آپ کو کروڑوں میل دور
محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اسے لاہور کی گلیاں، شاد باغ کے آموں کے جھنڈ، صبح صبح کوئل کی
لڑکیاں، انجی کی رسیلی آنکھیں، اس رات کلب کے ہال میں اس کی بے اعتنائی، باغ جناح کی صاف ستھری
اور ملاں حسین کی دہی کی لسی بہت یاد آ رہی تھی۔ دوسرے ہی دن وہ اس قدر اداس ہو گیا کہ اس نے
صابر سے پیسے لے کر ہوائی جہاز میں اگلے روز کی سیٹ حاصل کر لی۔ صابر نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ
کچھ روز تو اور رک جائے۔ کم از کم مشرقی پاکستان کے دیہات کی آوارہ گردی اور طوفان خیز دریاؤں
کی سیر تو کرے۔ مگر چنار کو اب ڈھاکہ کا ٹکٹ کو دوڑ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد لاہور پہنچنا چاہتا
تھا۔

چنانچہ دوسرے دن وہ صبح سویرے ہی ائیر پورٹ پہنچ کر ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا۔ ٹھیک
چھ بجکر دس منٹ پر جہاز نے ٹیک آف کیا اور لاہور کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیا۔
لاہور پہنچ کر جب جہاز نے نیچے اترنے کے لیے جھک کر پرواز کی تو چنار ماڈل ٹاؤن، گلبرگ
کینال بینک اور گڑھی شاہو کے مکانوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہونے لگا۔

تھیلا کندھے پر ڈالے وہ گھر میں داخل ہوا تو ڈاکٹر ہومیو بکرے کے پائے چٹ کرنے کے
بعد پیٹ پر گرم پانی کی بوتل رکھے پانی سے کسی دوائی کا سفوف کھا رہے تھے۔ چنار کو وہ دیکھ کر
حیران رہ گئے۔

"کمال ہے بھئی — تم اچانک ہی غائب ہو گئے اور اب اچانک ظاہر ہو گئے
ہو، کہاں چلے گئے تھے؟"

زلفی پانی کا گلاس لیے ان کے پاس ہی کھڑی تھی اس کے چہرے پر کچھ پریشانی کے
آثار تھے۔

"تم نے یار میں بڑی پریشانی میں ڈال دیا تھا کم از کم ہمیں بتا تو جاتے۔ مجھے
تمہارے بارے میں بڑے خدشات آنے لگے تھے ~~پریشانی~~ ہو بیٹی۔"

چنار جھکے سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا کمرہ صاف ستھرا تھا۔ ہر

چیز اپنی جگہ پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھی اور گرد کا نشان تک نہ تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ سب کارستانی
اس کی بھینس جیسی بیوی زلفی بیگم کی ہے لیکن وہ پریشان سی کیوں لگ رہی تھی؟ اس نے جلدی جلدی منہ
ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور سیدھا اپنے دفتر جا کر حاضری کی رپورٹ دی۔ شام کو دفتر سے نکل کر
وہ سیدھا سماوار ٹی ہاؤس گیا۔ اپنے سارے دوستوں سے ملا۔ کسی کا مذاق اڑایا، کسی کے شعر کو بکواس
کہا۔ انھیں بڑے جوشیلے انداز میں مشرقی پاکستان جا کر وہاں کے شاعروں کے آگے زانوئے تلمذ تہ
کرنے کی تلقین کی۔

ابلق سے کہا

"تم صبح اٹھ کر بھجن گانے کی بجائے دوڑ لگایا کرو۔ کیونکہ تم کند ذہن ہو، شاید دوڑنے
سے تمہارے دماغ میں کچھ حرکت پیدا ہو۔"

شاعر بور کی سے کہا

"تم شاعری چھوڑ کر سب سے پہلے اپنی ٹوپی سر سے اتارو اور پھر لائے موسے کے
کسی گاؤں میں جا کر گھاس کھودنے کا دھندا شروع کر دو۔ اس طرح تمھیں وہاں کے لوگوں
کے ساتھ رہنے کا موقع ہی نہیں ملے گا بلکہ تمہارے دماغ میں لگے ہوئے سماوار ٹی
ہاؤس کے جالے بھی کھلی ہوا میں اتر جائیں گے۔"

جمی کولا اور چانکیہ وہاں نہیں تھے اگر وہ موجود ہوتے تو چنار انھیں بھی کوئی نہ کوئی نصیحت
کرتا۔ وہ ہوٹل سے باہر نکل رہا تھا کہ دروازے میں مہاتما سے ملاقات ہو گئی۔

"ارے تم؟ — کہاں چلے گئے تھے؟"

چنار نے مہاتما کے گلے میں بازو ڈال کر اسے اپنے ساتھ لے لیا۔

"مشرقی بنگال گیا ہوا تھا، کیسا ملک ہے۔ کیا لوگ ہیں۔ غربت اور محبت کا حیرت انگیز
ملاپ نظر آیا ہے۔ مہاتما تم وہاں جا کر آباد ہو جاؤ۔ تمہارے لیے وہ جگہ بڑی موزوں
ہے۔ بالکل تمہاری ہی طرح کے کم زبان اور چپ چاپ دکھ سہنے اور خوش رہنے والے
لوگ ہیں۔"

مہاتما ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں اس شہر سے باہر نہیں جا سکتا میری کچھ مجبوریاں ہیں ——"

"مجبوری کوئی شے نہیں ہوتی آدمی کو ہر کام کر گذرنا چاہیے۔ زندگی میں انقلاب پیدا کرو۔ ایک خوبصورت اور خوش آئند انقلاب ——"

"انقلاب، زندگی، خوبصورتی —— یہ سب میرے لیے دور از کار کی باتیں ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ مجھے دن میں کالج میں پڑھنا اور رات کو اپنی بوڑھی ماں اور بہنوں کے لیے ایک فرم میں کام کرنا پڑتا ہے۔ مجھے بس کے لیے گھنٹہ گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بجلی کے بل ہیں، دودھ والے، دھوبی، سبزی والے اور اخبار والے کے بل ہیں۔ مکان کا کرایہ ہے، راشن کا بڑ ہے۔ بہنوں کی شادیوں کا فکر ہے۔ مس گاگل کا عشق ہے۔ چائی ملا دودھ، موبل آئیل ملا گھی، چربی ملی مرچیں اور ریت ملا آٹا ہے ——"

چنار نے اپنے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور سگریٹ ہرگ کے کنارے پھینک دیا۔ وہ بیچ اور گرد اداس ہو گیا۔

"اچھا بھائی، میں چلتا ہوں ——"

اس نے ہاتھ ملایا اور جلدی سے ہرگ پار کر کے سامنے والے فٹ پاتھ پر ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ وہ نجمی کو ملنے اس کی نیلی آنکھوں اور سورج کی سنہری کرنوں ایسے ریشمی بالوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ جس وقت وہ نجمی کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو سورج یوکلپٹس کے درختوں کے اوپر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور نیلی فضاؤں میں سفید کبوتر پرواز کر رہے تھے۔ دروازے پر جھکی ہوئی سفید گلاب کی بیل کے اندر چڑیوں کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوا تو لان میں لیموں کے درختوں تلے بیٹھی ہوئی نجمی کی چھوٹی بہن نسی اور اس کی سہیلی نیلی نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

"بائی چیری ——"

[illegible] کسی نے بھی نہ پوچھا کہ وہ اتنے دن کہاں رہا۔ شاید انھیں خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کہیں گیا تھا یا نہیں۔ شاید انھیں محسوس ہی نہیں ہوا کہ ان کا کوئی

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

دوست ان سے اتنے دن دور رہا ہے۔ دونوں لڑکیاں ڈیڈنگ کارڈ پر گم رہی تھیں۔ چنار نے پھر ایک بار شادی کا کارڈ اٹھا کر دیکھا۔

"کس کی شادی ہو رہی ہے؟"

"ارے تمھیں پتہ نہیں —— نجمی کی شادی ہے ناں اگلے ہفتے ——"

چنار کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا ہو۔ وہ ایک دم سنبھل گیا۔ اس نے شادی والا کارڈ میز پر رکھ دیا اور تمباکو کی تھیلی نکال کر سگریٹ بنانے لگا۔ وہ کچھ اس خیال سے ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگ گیا کہ کہیں وہ اس کے چہرے سے کسی بات کا اندازہ نہ کر لیں۔

اچانک برآمدے والے کمرے کی جانب سے نجمی کی آواز آئی وہ باہر آ رہی تھی۔ چنار آہستہ سے اٹھا اور کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس نے آخری بار دروازے پر جھکی ہوئی گلاب کے سفید پھولوں سے لدی ہوئی بیل کو دیکھا۔ وہ پھر اس کوٹھی میں کبھی نہیں آئے گا۔ وہ صرف نجمی کی نیلی آنکھیں دیکھنے آیا تھا اور یہاں آ کر اس نے نجمی کو اپنی بیوی کے ساتھ جھولا عروسی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور وہ بیویوں کا بڑا احترام کرتا تھا۔

چنار رات کو کافی دیر سے گھر آیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے کپڑے بدلے۔ کمبل اوڑھ کر پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ شروع کر دیا۔ آج اسے ہر اسٹیشن ویران دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کوئی گاڑی نہ کھڑی تھی کہیں کوئی مسافر نہ دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور چنار سمجھ گیا کہ کون اندر آیا ہے۔ اس نے ٹائم ٹیبل سے نظریں بالکل نہ ہٹائیں۔ زلفی بوجھل قدم اٹھاتی پلنگ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ چنار نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ زلفی چپکے سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ چنار بدستور مطالعے میں محو رہا۔ زلفی کے جسم میں مہک رہا۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہا ہے۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ زلفی اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے ٹائم ٹیبل پرے رکھ دیا۔

"کیا بات ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زلفی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اُسی طرح روتی رہی۔

"بھئی آخر کچھ تو بتاؤ۔"

زلفی روتی چلی گئی۔ چنار کو وہ بہت بُری لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اُسے چوٹی سے پکڑ کر اٹھائے اور چوہیا کی طرح دروازے سے باہر پھینک دے۔ آخر ان لوگوں نے کیا نحوست پیدا رکھی ہے ہر طرف۔ اتنی خوبصورت دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔

"بھئی کچھ پتہ بھی چلے۔ آخر کیا ہو گیا ہے۔؟"

"جو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں ماں بننے والی ہوں۔"

چنار سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت ایک دم اُس کے اوپر آ گری ہو۔ وہ زلفی کو دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں اور ناک پونچھ رہی تھی۔

چنار کو بے حد کراہت محسوس ہوئی۔

"مگر یہ کیسے ہو گیا؟"

"جیسے ہوا کرتا ہے۔"

"اب کیا ہو گا؟"

"میں خودکشی کر لوں گی۔ میں اپنے ماں باپ کی عزت برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

اور زلفی ایک بار پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ جب وہ چلی گئی تو چنار کی نیند اڑ چکی تھی۔ اس نے کپڑے پہنے اور کمرے میں چکر لگانا شروع کر دیئے۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ بنا رہا تھا اور پھونکے جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں گویا ہزاروں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ اُسے ان تمام لوگوں سے نفرت، انتہائی شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ جنھوں نے اُسے بے معنی چکروں میں پھنسا رکھا تھا۔ ایک وہ بھی ہے جو اُسے یوں بھلا رہی ہے جیسے وہ راستے کا پتھر ہو۔ اور ایک یہ [illegible] اپنے گناہوں کا بوجھ اُس کے سر پر ڈالنا چاہتی ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ اُس نے زور سے تھوکا اور زلفی کو دو تین گالیاں دے ڈالیں۔ یہاں کی فضا کسقدر

Urdu Photo.com

عورت اور مکروہ ہے۔ یہ لوگ کسقدر گندے اور واہیات ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے بزدل بھائی ہیں جنھیں ان کی بہنوں کی محبت نے زنخا بنا رکھا ہے اور اولاد کا خون چوسنے والے تن آسان باپ ہیں۔ پیٹھ کرنے والی عورتیں ہیں۔ مہمانوں کے آگے پیچھے پھر کر اُن کی پیٹھ پیچھے انھیں گالیاں دینے والے میزبان ہیں۔ زن مرید شوہر ہیں۔ خاوندوں کے لیے یک جلنے والی بیویاں ہیں۔ بیٹوں کو بیویوں کے خلاف سکھائی پڑھائی کرنے والی مائیں ہیں۔ دس روپوں کے لیے قسم کھانے والے "ایماندار" ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے پھولوں کی بات کرو تو انھیں چھینک آ جائے گی۔ درختوں کا ذکر کرو تو ناک صاف کرنے لگیں گے۔ چاند کی کہانی سناؤ تو اونگھنا شروع کر دیں گے۔ روپے کمانے کی سکیم بیان کرو تو کان کھڑے کر لیں گے۔ دوسرے کی برائی بیان کرو تو ہمہ تن گوش ہو جائیں گے۔ غیر کی تعریف کرو تو اندر سے جل بھن کر کباب ہو جائیں گے۔

کہاں ہیں وہ لوگ کہ منہ اندھیرے گیت گاتے دریاؤں میں کشتیوں کے بادبان کھولتے ہیں۔ دریا کے ایک کنارے پر کھانا پکاتے ہیں اور دوسرے کنارے پر جا کر کھاتے ہیں۔ سانپ کے بلوں میں ہاتھ ڈال کر قیمتی پتھر نکال باہر لاتے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک دریا کنارے آگ جلا کر کسان کے دکھ درد اور خوشیوں کے گیت گاتے ہیں۔ شعلہ بن کر رقص کرتے ہیں۔ بالوں میں چمپا کلی کے پھول اور ماتھے پر تلک لگاتے ہیں۔ گرم چکیلے بازاروں میں تیکھی نگاہ سے دیکھتے ہوئے قریب سے گذر جاتے ہیں۔ سلیمر کے جنگلے پر جھکے جھکے گرم ہاتھ پر سلگتا ہوا اپنا ہاتھ رکھ کر محبت کی سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں۔ ناریل کے درختوں میں رقص و نغمے کے جھومر ڈالتے ہیں۔ بانسری پر بھیالی گاتے ہیں۔ پدما دریا میں کشتی رانی کرتے ہیں۔ پھٹے ہوئے بادبانوں کے ساتھ سینہ تان کر کھڑے رہتے ہیں۔ چٹاگانگ کے اونچے ٹیرس والے بنگلے میں غالب کی غزلیں گاتے ہیں شاہ باغ ہوٹل کے لانج میں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔ پھول باڑی کے دیہاتوں میں ننگے پاؤں گھوم پھر کر زندہ اور پُرخون محبت کے دلگداز گیت گاتے ہیں۔ چنار کو اُس بیراگن کا خیال ستانے لگا جسے اُس کے دوست صالح نے تالاب میں نہاتے ہوئے بانس کے درختوں میں چھپ کر دیکھا تھا جس کی خوبصورتی نے اسٹیشن پر اک آگ لگا دی تھی۔ وہ بیراگن یقیناً آج بھی انہی دیہاتوں میں گھوم پھر کر محبت کے لازوال گیت گاتی ہو گی۔ اُس کا کاروباری دوست پٹ سن کی گانٹھوں پر بیٹھ کر عشق کرنا چاہتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ بے وقوف تھا وہ —!

میں اس ہیرا گن کو ضرور ڈھونڈ کر رہوں گا وہ محبت کی اوتار ہے۔ میری روح اور میرے جسم کو اسی عورت کی آغوش میں سکون ملے گا۔ میں کل ہی یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔ اس گندے جوہڑ کی دلدل میں میری روح فنا ہو جائے گی۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی چنار نے جلدی جلدی اپنے تھیلے میں کچھ کتابیں اور چند ایک ضروری چیزیں رکھیں اور پلنگ پر بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنے لگا۔ جب کمرے کے روشندانوں پر صبح کا سپیدہ نمودار ہوا تو چنار نے تھیلا اٹھایا۔ دروازہ کھول کر گلی میں نکلا اور تیز تیز قدموں سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے پیسے گنے اس کے پاس صرف کراچی تک کا کرایہ ہی تھا۔ کراچی سے آگے چٹاگانگ جانے والے بحری جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اس نے کراچی کا ٹکٹ لے لیا اور پلیٹ فارم پر جا کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ کافی دیر ادھر ادھر چکر لگانے کے بعد وہ ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

میں ابھی تک اسی بنچ پر بیٹھا ہوں۔

کراچی جانیوالی گاڑی ابھی تک نہیں آئی۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے باریش بزرگ نے اپنی کتاب ختم کر لی ہے۔ ذرا پرے ہٹ کر سامان کے انبار کے پاس بیٹھی برقعہ پوش لڑکی نے تھک کر اب پہلو بدل لیا ہے۔ لیکن میں اب بھی اسے بغیر اکتائے اسی دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں اسلیے کہ میں فطرتاً عاشق مزاج ہوں جیسا کہ آپکو اس کہانی کے تصنیف کرنیوالے کی زبانی میری داستان پڑھ کر اندازہ ہو گیا ہو گا۔ آپ لوگ یقیناً دل ہی دل میں مجھے برا بھلا کہہ رہے ہوں گے مگر میں آپ لوگوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔ میں نے کبھی آپ لوگوں کو پسند نہیں کیا۔ آپ لوگوں سے تنگ آ کر ہی میں اپنے شہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ بھی میرے یہاں سے چلے جانے پر ضرور خوش ہوں گے۔ مجھے اس لیے خوش ہو گی کہ اب وہ اپنے عاشق سے اچانک مل جانے کے خیال سے بے نیاز ہو کر اپنے خاوند کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکے گی۔ سماوار ٹی ہاؤس والے دوست اسلیے خوش ہونگے کہ اب بیٹھ کر احمقانہ باتیں کر سکیں گے۔ ایک دوسرے کی بدخوئی، خصومت اور برائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں گے۔ اور کوئی ان کی باتوں پر اعتراض کرنیوالا نہیں ہو گا۔ کوئی انھیں ان کے گریبان کھول کر داغ دکھانے والا نہیں ہو گا۔ اگر کسی کو صدمہ ہو گا تو صرف زلفی کو۔ اسلیے نہیں کہ اس کا محبوب اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بلکہ اسلیے کہ چور اسکے گھر میں نقب لگا کر اسکا سب کچھ لوٹ کر بھاگ گیا ہے۔ اسے صدمہ ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ مجھے اس سے کیا۔ آخر اس چوری میں وہ بھی تو برابر کی شریک تھی۔ یہ تالی میں نے ایک ہاتھ سے تو نہیں بجائی اسکے کان کتنے لمبے ہیں؟ اف توبہ! بالکل ہتھنیوں ایسے کان ہیں۔ جو بھی اس سے شادی کرے گا ہمیشہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتا رہے گا۔

یہ شور کیسا ہے؟ — یہ لیجئے گاڑی آ گئی۔ چٹاگانگ، نیلی کومیلا، پاربتی پور، فرید پور، تیج گاؤں، اڈھاکہ اور سندربن جانیوالی، پھول باڑی جانیوالی گاڑی آ گئی۔ سب مسافر اٹھ کھڑے ہوئے بعضوں نے تو ادھر ادھر بھاگنا بھی شروع کر دیا ہے۔ برقعہ پوش لڑکی بھی کھڑی ہو کر برقعہ درست کر رہی ہے۔ میں اس لڑکی کے ساتھ والے ڈبے میں بیٹھوں گا۔ اگر یہ کراچی جا رہی ہے تو ملتان تک اس سے راہ و رسم ضرور ہو جائیگا۔ میں بھی تھیلا بغل میں

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگائے ایک طرف کھڑا ہو گیا ہوں کیونکہ تھرڈ کلاس کا معاملہ ہے۔ کھڑکی میں سے ڈبے میں کودنا ہو گا۔

چنار کو معلوم تھا کہ تھرڈ کلاس کے ڈبے گاڑی کے آگے لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ تھیلہ بغل میں لگائے پلیٹ فارم کے سیدھے رُخ کو چل پڑا۔ اچانک اس کی نظر پلیٹ فارم کی دیوار کے نیچے اوندھے منہ پڑے ہوئے ایک گیارہ بارہ سال کے لڑکے پر پڑی۔ اُسکا پیٹ پچک گیا تھا۔ ٹانگیں سوکھ کر لکڑی ہو رہی تھیں۔ گندا پاجامہ اور پھٹا ہوا کرتا آنکھیں سوکھ کر پتھرا گئی تھیں۔ کھلے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک پاؤں ننگا تھا اور دوسرے پاؤں کا پھٹا ہوا جوتا دور پڑا تھا۔ کچھ خدا ترس لوگوں نے اُسے ہسپتال پہنچانے کی بجائے اس کے پاس کچھ پیسے ڈال دیئے تھے۔ چنار چوری آنکھ سے اُسے دیکھتا ہوا آگے گذر گیا اور دیوار والے نکڑ کے پاس جا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے اس لڑکے کی بربادی اور بدنصیبی کا وہی ذمہ دار ہے۔ اسکی ماں کہاں ہے؟ اُسے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دودھ پلانے والی! اسکی آنکھوں میں سرمہ ڈال کر بلائیں لینے والی، سکول روانہ کرنیوالی ماں کہاں ہے؟ وہ بہنیں کہاں ہیں جنھوں نے اسے اپنے ہاتھوں دولہا بنا کر دلہن کے گھر کو بھیجنا تھا۔ وہ بھائی کہاں ہیں جنھیں اس بدنصیب بے یار و مددگار لڑکے کے بازو بننا تھا؟ کیا اسکی ماں نے خودکشی کر لی تھی؟ کیا بدنامی سے بچنے کے لیے وہ اسے کسی بدرو کے کنارے رکھ گئی تھی جہاں سے غربت مغلوک الحال چیتھڑے بن کر اس سے چپک گئی اور زندگی کی خونخوار گلیوں میں اسکا گوشت نچواتی رہی۔

"امی! امی! گاڑی۔ آہا ہا۔ گاڑی" چنار نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ایک بڑا ہی پیارا بچہ کراچی ایکسپریس کو پلیٹ فارم میں داخل ہوتا دیکھ کر اپنی پاس کھڑی ماں کا برقعہ کھینچ کھینچ کر ادھر اُدھر متوجہ کر رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ تھرڈ کلاس کا ڈبہ چنار کے عین سامنے آ گیا تھا۔ لیکن چنار گاڑی میں سوار ہونے کی بجائے باہر نکل آیا۔

باہر آ کر اس نے ٹکٹ واپس کیا اور سیدھا گھر آ گیا۔ زلفی اُسے دروازے پر ہی ملی۔

"ذرا میرے کمرے میں آؤ" تھوڑی دیر بعد زلفی اس کے کمرے میں تھی جسے جھاڑ پونچھ کر اس نے ہر شے سلیقے سے لگا رکھی تھی۔ زلفی کے اندر آتے ہی چنار نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "گھبراؤ نہیں زلفی۔ میں — میں تم سے شادی کروں گا۔"

زلفی حیرت اور مسرت کے ملے جلے احساس سے اُسے تکتی ہی رہ گئی۔ اس نے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔ چنار نے پھول باڑی والی بیراگن کو آخری بار بانس کے جنگل میں گم ہوتے دیکھا اسکے سیاہ بالوں میں گل مہر کا سرخ پھول آنکھ مار کر بٹا دبک رہا تھا اور وہ اسکی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھتی مسکراتی جنگل کے اندھیروں میں گم ہو رہی تھی۔